اقبالؒ

از

عطیہ بیگم

مترجمہ

ضیاء الدین احمد برنی، بی اے

اقبالؒ

از

عطیہ بیگم

مترجمہ

ضیاء الدین احمد برنی۔ بی اے

ناشر

اقبال اکیڈمی — کراچی

سلسلۂ مطبوعاتِ اقبال اکیڈیمی ـــــ پاکستان
کراچی

بارِ اوّل: ستمبر ۱۹۵۶ء
بارِ دوم: مارچ ۱۹۶۹ء
تعداد: ۱۰۰۰
قیمت: چار روپے ۵۰ پیسے

اہتمام
م، ع، سلام۔ آئینۂ ادب چوک مینار
انارکلی ـــ لاہور

(اشرف پریس۔ لاہور میں چھپی)

فہرست مضامین

تمہید (از مترجم) ۵

سببِ اشاعت (از عطیہ بیگم) ۱۳

اقبال (از عطیہ بیگم) ۱۵

ڈائری (از عطیہ بیگم) ۹۳

ایک بھولی ہوئی صحبت (از مترجم) ۱۲۲

خطوط اقبال کے بلاک ۱۲۹

نظموں کے بلاک ۱۶۲

تمہید

میں دلی مسرّت کے ساتھ علاّمہ اقبال مرحوم کے ان خطوط کو جو اُنہوں نے محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ کے نام انگریزی زبان میں تحریر کئے تھے اُردو کا لباس پہنا رہا ہوں۔ ان خطوط کا سلسلہ ۱۹۰۷ء سے شروع ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ بہت سے خط امتدادِ زمانہ کی نذر ہو گئے اور جیسا کہ محترمہ نے بیان کیا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت اُن کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر وہ موجود ہوتے تو اقبالؔ کی عظیم المرتبت شخصیّت کے وہ خدوخال جو ابھی تک پردۂ اخفا میں ہیں، روشنی میں آ جاتے اور دنیا کو ان سے مستفید ہونے کا موقع ملتا۔

یہ خطوط جہاں تک اقبالؔ کی زندگی کا تعلق ہے، گہری دلچسپی سے پڑھے جانے کی چیز ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں اُنہوں نے یورپ میں کس قسم کی زندگی بسر کی تھی۔ ہندوستان آنے پر ان پر کیا کیا افتادیں پڑیں اور وہ کیسی کیسی ذہنی تکلیفوں اور پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ ایک خط سے

اُن کی گھریلو زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ وہ پہلو ہے جو آج تک پبلک کی نظروں کے سامنے نہیں آیا۔ اس دور کی نظمیں بھی سرتا پا سوز و گداز سے پُر ہیں اور پڑھنے والے پر ایک خاص کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔ اگر عطیہ بیگم صاحبہ اقبالؔ کو عالمِ یاس و قنوطیت سے باہر نہ نکال لاتیں تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رجحانِ طبیعت کہاں پر جا کر ختم ہوتا۔

بعض خطوں سے اقبالؔ کا رجحانِ طبیعت جرمن خاتون ویگے ناسٹ کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں کہ "میں اس لڑکی کو پسند کرتا ہوں۔ وہ کس قدر اچھی اور سچی ہے!" ممکن ہے کہ اس رجحان طبیعت کی وجہ یہ ہو کہ وہ فلسفی تھیں۔ حُسنِ صورت اور حُسنِ سیرت سے آراستہ تھیں اور دونوں کی طبیعتوں میں یکسانیت تھی۔ بہرحال جب تک ٹھوس شہادت نہ ملے اس وقت تک یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ انہی کی خاطر ہندوستان چھوڑ دینے اور یورپ جا بسنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔

بعض خطوط سے اقبالؔ کے ذاتی خصائص اور اوصاف پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ سچی دوستی کے بھوکے تھے اور جہاں کہیں اُنہیں سچی دوستی ملتی تھی اُس کی وہ دل سے قدر کرتے تھے۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں چاہتے تھے کہ کسی سچے دوست کے دل میں اُن کی طرف سے غلط فہمی پیدا ہو اور جب کبھی سوءِ اتفاق سے وہ پیدا ہو جاتی تھی تو وہ ہزار جتن کر کے اسے دُور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اقبالؔ کی یہ خصوصیت ایسی ہے جس سے اُنہیں زیادہ بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جن سے یہ اندازہ

کیا جاسکتا ہے کہ اقبالؔ نے دنیاوی وجاہت کی کبھی پروا نہیں کی اور اگرچہ اُن پر بُرے وقت بھی آئے لیکن وہ بدستور سابق فلسفی، شاعر اور خواب دیکھنے والے ہی رہے۔

جس ایک پہلو پر میں تفصیل سے روشنی ڈالنا چاہتا ہوں وہ اقبالؔ اور عطیہ بیگم کے باہمی تعلقات ہیں۔ جہاں تک خطوط سے معلوم کیا جاسکتا ہے اقبالؔ بے تکلفی کے باوجود ان کا احترام کرتے تھے۔ اور اس بے تکلفی اور احترام دونوں کی جھلک خطوں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ میرے اپنے ذاتی مشاہدات سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ اقبالؔ اُن کے ساتھ خصوصیت سے پیش آتے تھے اور خود عطیہ بیگم بھی ان کی عظیم المرتبت شخصیت کا پورا پورا خیال رکھتی تھیں۔ دراصل یہ خطوط دو ایسی شخصیتوں کے باہمی تبادلہ خیالات کا عکس ہیں جو اپنے طور پر ہنگامہ پرور اور عجیب و غریب واقع ہوئی ہیں۔ ان کی دوستی ۴۰ سال قبل شروع ہوئی اور آخر وقت تک قائم رہی۔ اقبالؔ نہ صرف انہیں نظمیں بھیجتے تھے اور اُن سے تنقید کے طالب ہوتے تھے بلکہ اُنہوں نے اپنے مقالے بھی یونیورسٹی میں بھیجنے سے پہلے انہیں پڑھ کر سنائے تھے اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ ان پر تبصرہ کریں۔ چنانچہ بعض خطوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اقبالؔ ان کے تبصروں سے ایک حد تک مستفید بھی ہوئے۔ اپنے دلی درد یا سوزِ دروں کی کہانی اقبالؔ نے اپنے خطوط میں انہی کو اور غالباً صرف انہی کو سُنائی اور اس کی بدیہی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اقبالؔ جانتے تھے کہ سوائے اُن کے اور کوئی ہستی ایسی نہیں جو ان کے دلی جذبات کو سمجھتی ہو اور ان کی

تنوطیت کو دُور کر کے ان میں امید، روشنی اور سکون پیدا کر سکتی ہو۔ بہرحال دو یکساں طبیعت رکھنے والے افراد کی یہ نہ ٹوٹنے والی دوستی تھی جو خطوں کی شکل میں وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتی رہی۔

اصل خطوط انگریزی میں ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ انشاء پردازی کے اعتبار سے وہ اعلیٰ لٹریچر میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔ اقبالؔ کو انگریزی پر اتنی ہی قدرت تھی جتنی اردو یا فارسی پر تھی۔ خطوط انگریزی فن انشاء کا بہترین نمونہ ہیں اور مجھے اعتراف ہے کہ میرا ترجمہ اتنا زوردار نہیں۔

یہ محض خطوط اقبالؔ نہیں ہیں بلکہ محترمہ عطیہؔ بیگم نے اقبال کی زندگی کے واقعات کو خطوں کی روشنی میں اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ایک منفرد چیز بن گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کا نام "اقبالؔ از عطیہؔ بیگم" رکھا گیا ہے یعنی اقبالؔ جیسا کہ محترمہ انہیں سمجھتی تھیں۔

اقبالؔ کی بہت سی تحریریں ابھی تک پردۂ گمنامی میں پڑی ہوئی ہیں اور ضرورت ہے کہ اقبالؔ کے شیدائی انہیں قعرِ گمنامی سے نکالیں اور پبلک کے استفادہ کے لئے انہیں شائع کریں۔

اس مجموعہ کے ساتھ میں عطیہ بیگم صاحبہ کی ڈائری کے وہ حصے بھی شائع کر رہا ہوں جن کا تعلق اقبالؔ کی ذاتِ گرامی سے ہے۔ ڈائری قریب قریب انہی کے الفاظ میں دی گئی ہے۔ میرا اپنا تصرف تو صرف اتنا ہے کہ میں نے کہیں کہیں ہجوں کو ٹھیک کر دیا ہے اور بعض جگہ لفظی ترمیمات کر کے سقم کو یا اس کے انگریزی پن کو دُور کر دیا ہے اور بس۔

آخر میں میں محترمہ کا شکر گذار ہوں کہ اُنہوں نے مجھے اپنی کتاب کے ترجمہ کی اجازت کے ساتھ ساتھ اپنی ڈائری بھی بغرضِ شمولیت عنایت فرمائی ——!

بمبئی، مارچ ۱۹۴۷ء ضیاءالدّین احمد برنی

کراچی ستمبر ۱۹۵۶ء

اقبال

سببِ اشاعت ——— ۱۳
اقبالؔ ——— ۱۵
ہائیڈلبرگ، جرمنی ——— ۳۵

سببِ اشاعت

یہ عجیب سی بات خیال کی جائے گی کہ میں نے اقبالؔ کے خطوط کو اور یورپ میں ان کی تعلیمی زندگی کے بارے میں اپنے تاثرات کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ کیا، حالانکہ اتنے برس ایسی کتاب کا مواد میرے پاس اس طرح پڑا رہا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ اس وقت بھی میں یہ تمام معلومات اپنی مرضی سے پبلک کے سامنے پیش نہیں کر رہی ہوں اس لئے کہ اس قسم کا خیال میرے دل و دماغ میں کبھی بھی نہیں آسکتا تھا۔ یہ بات نہیں ہے کہ میں اس مجموعہ کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ اس کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہو، لیکن میں پبلسٹی پر کسی قسم کا یقین نہ رکھتے ہوئے ایسے اقدام میں جھجک محسوس کر رہی تھی اور یہی وجہ ہے کہ یہ سارا مواد اب تک عام نظروں سے پوشیدہ رہا۔ چند ایک کو اتنا علم ضرور تھا کہ میرے پاس اقبالؔ کی بعض اصل نظمیں موجود ہیں اور اُن کی اشاعت کے لئے بھی درخواستیں مجھ تک پہنچی تھیں لیکن میں نے ایسی درخواستوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا (اس لئے کہ بعض تو شوقِ دیدار پورا کرنے کے لئے

کی گئی تھیں اور بعض ذاتی منفعت پر مبنی تھیں) یہاں تک کہ ریاست حیدرآباد کے حالیہ سفر میں میری ملاقات امیر پائیگاہ جناب نواب حسن یار جنگ بہادر سے ہوئی۔

مجھے نواب حسن یار جنگ کی قائم کردہ "اقبال سوسائٹی" کے ایک جلسہ میں مدعو کیا گیا تھا جہاں فلسفۂ اقبال کی تعلیم اور تشریح ایسی صداقت اور ایسی سچی دلچسپی کے ساتھ عمل میں لائی جاتی ہے کہ میں نے ایسے ادارے کے قیام کے منشا کی طاقت کو محسوس کر لیا اور جب میں نے دیکھا کہ کس قدر تکلیف، قربانی اور محنت کے ساتھ کام جاری رکھا جاتا ہے تو مجھ پر غیر شعوری طریقہ پر اس کی صداقت اور عزم کا اثر پڑا۔ میں نے نواب حسن یار جنگ — کو اس اسلامی تعلیم کا کہ "علم کا حاصل کرنا سب سے افضل چیز ہے اور اس کی تلاش کے لئے انسان کو دنیا کے دوسرے کنارے (چین) بھی جانا چاہئے" مجسم نمونہ پایا۔ نہ صرف یہ کہ وہ خود علم حاصل کرنے کی جستجو میں لگے رہتے ہیں بلکہ اپنے اس ادارہ کے ذریعہ وہ اس مطمح نظر تک پہنچنے کے لئے ہر ایک کی امداد بھی کرتے ہیں اور یہی وہ بہترین عمل ہے جسے ایک سچا مسلمان انجام دے سکتا ہے۔ نواب حسن یار جنگ ہی نے اس خیال کا اظہار کیا تھا اور میرے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ میں اس خیال کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے پبلک کے روبرو اس مجموعہ کو پیش کر دوں۔

میں مس ہلا وکیل اور ضیاء الدین احمد برنی کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے انگریزی کتاب کے پروف پڑھے۔

عطیہ بیگم

اقبالؒ

۲۲- اگست ۱۹۰۷ء کو ہائیڈلبرگ کی علمی اور حقیقت پسندانہ زندگی صوفیانہ فضا سے معمور تھی اور یونیورسٹی کے پروفیسر حیران و پریشان ہو رہے تھے کہ کس طرح اقبالؒ کو اس حالتِ استغراق سے باہر نکالیں جو اس سے قبل کی رات سے ان پر طاری تھی۔ فرا پروفیسر سینے شل اور فرا لائن ویگے ناسٹ تو بالکل گھبرا گئیں جب اُنہوں نے اقبالؒ کو اس حالت میں دیکھا کہ وہ اکڑے ہوئے بے جان سے بیٹھے ہیں۔ اُن کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی ایک کتاب پر جمی ہیں جو اُن کے سامنے پڑی تھی اور وہ گرد و پیش کے حالات سے بالکل بے خبر ہیں۔ ساری پارٹی جو پکنک پر جانے کے لئے وہاں پہلے سے جمع ہو گئی تھی، اُنہیں اس حالت میں دیکھ کر بدحواس تھی۔ پروفیسر اقبالؒ کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا رات کی ٹھنڈ میں وہ جم کر رہ گئے ہیں؟ اور کیا اُن کی طبعی حالت بحال ہو جائے گی؟ یہ تھے وہ سوالات جو پارٹی کے ہر شخص کے دماغ میں گشت کر رہے تھے جو سیر سپاٹے کے لئے وہاں جمع ہوئی تھی اور جس

میں اقبالؔ بھی شامل ہونے والے تھے۔

اقبالؔ ہائیڈلبرگ میں اپنے فلسفیانہ مطالعہ کی تکمیل کے سلسلہ میں مقیم تھے۔ ہائیڈلبرگ ایسے طلبا کے لئے ہر قسم کی آسانی فراہم کرتا تھا۔ یہاں دنیا کے ہر معلومہ علم کا جوہر نکھری ہوئی حالت میں ملتا تھا اور اس تک علم کے شیدائی کی رسائی آسانی سے ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سمجھ دار اور اولوالعزم اشخاص کی نگاہ میں اس مقام نے عام زیارت گاہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اقبالؔ نے جرمن زبان پر عبور حاصل کرنے میں مشکل سے تین مہینے صرف کئے ہوں گے اور اسی ایک واقعہ سے پروفیسروں کی نگاہوں میں ذہنی لحاظ سے اُن کی دھاک بیٹھ گئی تھی اور وہ انہیں ایک عجوبہ خیال کرنے لگ گئے تھے۔ اس چیز نے اور ان کے صوفیانہ خیالات نے اُن کے بارے میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ وہ طلباء کی سطح سے بہت بلند ہیں۔

اُن کی اس صوفیانہ افتادِ طبیعت کی تشریح کرنے کی غرض سے میں اقبالؔ کے بچپن کا ایک واقعہ بیان کروں گی۔ جس نے اُن کے خیالات کی رو پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے ان نفسیاتی پہلوؤں کو اپنے والد کی تعلیمات کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ اُن کو علم حاصل کرنے کا شوق بزرگوں سے ورثہ میں ملا تھا اور اس مقصد سے اُن کے والد نے ایک خدا رسیدہ بزرگ کے زیرِ ہدایت اعتکاف میں چند مہینے بسر بھی کئے تھے اور جو کچھ اُنہوں نے حاصل کیا تھا اُسے اُنہوں نے اپنے نوعمر بیٹے اقبالؔ کو منتقل کر دیا تھا حالانکہ وہ ابھی اعلیٰ روحانی علوم قبول کرنے کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے پورے

طور پر تیار نہ تھے۔ بیج موجود تھا اور اس کی آبیاری خود اقبال نے کی اور نتیجہ نے ظاہر کر دیا کہ یہ عمل دانشمندانہ تھا یا غیر دانشمندانہ۔ ان واقعات کی روشنی میں ہر شخص انہیں بہتر طریقہ سے سمجھ سکتا ہے اور ان بہت سے خیالات سے واقف ہو سکتا ہے جو بظاہر مبہم نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ایک واقعہ بھی بیان کیا جو اُس وقت کا ہے جب کہ اُن کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ آدھی رات کو خواب کی حالت میں اقبال نے کچھ شور سُنا جس سے اُن کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ اُنہوں نے دیکھا کہ اُن کی والدہ سیڑھیوں پر سے اُتر رہی ہیں۔ وہ اُٹھ بیٹھے اور خود بخود اُن کے پیچھے پیچھے سامنے کے دروازے تک چلے جو آدھا کھُلا تھا اور روشنی کی شعاعیں اُس میں سے آ رہی تھیں۔ اُن کی ماں اس نیم وا دروازے سے باہر دیکھ رہی تھیں۔ اقبال بھی اُن تک پہنچے اور دیکھا کہ اُن کے والد کھُلی جگہ میں بیٹھے ہیں اور روشنی کا ہالہ اُن کے گرد و پیش چمک رہا ہے اور جب اُنہوں نے ان تک پہنچنے کی کوشش کی تو اُن کی والدہ نے اُنہیں روکا اور کچھ کہہ سُن کر انہیں پھر سونے کے لئے پلنگ پر بھیج دیا۔ دوسرے دن علی الصباح جب اقبال بیدار ہوئے تو سب سے پہلی خواہش جو اُن کے دل میں پیدا ہوئی یہ تھی کہ وہ اپنے والد کے پاس جائیں اور معلوم کریں کہ وہ آدھی رات کو کیا کر رہے تھے۔ جب اقبال وہاں پہنچے تو اُنہوں نے دیکھا کہ اُن کی والدہ پہلے سے موجود ہیں اور اُن کے والد اُن سے بیان کر رہے ہیں کہ اس وجدانی کیفیت میں اُنہوں نے اس رات کو کیا دیکھا۔ اقبال نے اپنے والد کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ "کابل سے ایک قافلہ جو شہر کو آ رہا تھا وہ سخت

مصیبت میں مبتلا ہے اور اس وجہ سے اُسے ہمارے شہر سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر رکنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ قافلہ میں ایک بیمار شخص ہے جس کی حالت اس قدر زبوں ہے کہ قافلہ آگے نہیں جا سکتا۔ اس لئے میں نے طے کیا کہ مجھے وہاں فی الفور جانا چاہیئے تاکہ میں ضروری امداد کر سکوں۔" اس کے بعد اُن کے والد نے کچھ چیزیں لی اور قافلہ کی سمت روانہ ہو گئے۔ اقبالؔ بھی ساتھ ساتھ تھے اور اُنہوں نے دیکھا کہ اُن کے دل میں یہی دھن سمائی ہوئی ہے کہ جلد سے جلد قافلہ تک پہنچیں۔ خوش قسمتی سے قافلہ خلاف توقع جلد پہنچ گیا اور وہاں جا کر معلوم ہوا کہ لوگ اس بیمار شخص کی وجہ سے بے حد پریشان ہیں۔ قافلہ کی وضع قطع سے بدیہی طور پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی مالدار خاندان کے افراد پر مشتمل ہے جو علاج کے لئے کسی بڑے شہر کی طرف جا رہا ہے۔

جب وہ قافلہ والوں کے پاس پہنچے تو والد نے سالارِ کاروان سے درخواست کی کہ انہیں جلد سے جلد بیمار کے پاس پہنچا دیا جائے۔ اس سے وہ اچنبھے میں آ گیا اور مارے خوف کے انہیں سیدھا بیمار کے خیمہ میں لے گیا یہ پوچھے بغیر کہ اُنہیں بیماری کا علم کیسے ہوا۔ جب وہ بیمار کے پاس پہنچے تو والد نے دیکھا کہ مریض کی حالت بہت ہی سقیم ہے اس لئے کہ جس خوفناک بیماری میں وہ مبتلا تھا اُس نے اس کے جسمانی اعضاء کے کچھ حصوں کو کھا لیا ہے اور معلوم ہوتا تھا کہ جسم بھی آہستہ آہستہ گھل رہا ہے۔ اُنہوں نے خاک کی شکل کی کچھ چیز لی اور متاثرہ حصوں پر اُسے مل دیا اور جب

وہ یہ کام کر چکے تو اُنھوں نے اہل قافلہ کو یقین دلایا کہ بیمار اچھا ہو جائے گا۔ اور زندہ رہے گا اور اُن سے کہا کہ صرف خدا میں یہ طاقت ہے کہ وہ ضائع شدہ اعضا کا بدل پیدا کرے۔ بظاہر ان لوگوں کو اپنے محسن کی بات کا یقین نہیں آیا اور خود اقبال بھی متشکک تھے۔ لیکن آئندہ ۲۴ گھنٹے میں بہتری کے آثار نظر آنے لگ گئے اور خود مریض کو بھی یقین ہو گیا کہ وہ تندرست ہو جائے گا۔ اقبال کے والد کی خدمت میں معقول فیس پیش کی گئی لیکن اُنھوں نے اسے قبول کرنے سے قطعاً انکار کر دیا اور واپس چلے آئے۔ چند دن کے بعد قافلہ شہر میں پہنچ گیا اور معلوم ہوا کہ مریض بالکل صحت مند ہو گیا ہے۔ اقبال نے مجھ سے یہ واقعہ میری پہلی ملاقات سے چند دن بعد یورپ میں بیان کیا تھا جہاں میں فلسفہ کے مطالعہ کے سلسلہ میں مقیم تھی۔

لندن میں مس بیک کے مکان پر جہاں ہندوستانی طلبا اور ملاقاتی اسی غیر شاعرانہ اور غیر روح پرور ماحول میں جمع ہوا کرتے تھے میری اقبال سے پہلی ملاقات ہوئی۔ فلسفیانہ مضامین پر تبادلہ خیال کی وجہ سے اُنھوں نے مجھ سے خط و کتابت شروع کی اور اکثر مواقع پر اُنھوں نے چھٹیوں کے دن گزارنے کے لئے مقام کے تعین اور کتابوں کے انتخاب میں میری امداد طلب کی۔ جدید اور قدیم فلسفہ کے متعلقہ نصاب کو میں نے انہی دنوں ختم کیا تھا اور افلاطون اور نیٹشے جیسے فلسفیوں کے نظریوں کی تشریح کے بارے ہماری آراء میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اقبال مطمئن نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے خط و کتابت میں مباحثہ کو جاری رکھا اور بہت سے خطوط جواب دے دیئے جانے

کے بعد معرض وجود میں نہ رہے۔ اس لئے کہ اس وقت یہ محسوس نہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے اندر کوئی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اپریل ۱۹۰۷ء میں مجھے اُن کا ایک خط ملا جس کے ساتھ ایک نظم بھی منسلک تھی اور مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اس پر تنقید کروں۔ وہ نظم مع خط کے درج ذیل کی جاتی ہے،

ٹرینٹی کالج، کیمبرج

۲۴ر اپریل ۱۹۰۷ء

مائی ڈیر مس فیضی!

میں اس خط کے ہمراہ ایک نظم بھیج رہا ہوں جس کے بھیجنے کا میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا اور میں شکر گزار ہوں گا اگر آپ اسے غور سے پڑھیں گی اور اپنی تنقید سے مجھے مطلع کریں گی۔

میں آپ کو اپنی پولٹیکل اکانومی (اردو ایڈیشن) بھیجنے کا خیال کر رہا تھا لیکن مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس یہاں اس کا ایک بھی نسخہ موجود نہیں ہے اگرچہ ہندوستان سے اسے منگانے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ میں اس میل (ڈاک) سے اس کے لئے خط لکھ دوں گا۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گی۔

آپ کا صادق

ایس۔ ایم۔ اقبال

اے گل ز خارِ آرزو آزاد چوں رسیدۂ

تو ہم ز خاکِ ایں چمن مانندِ ما دمیدۂ

اے شبنم از فضائے گل آخر ستم چہ دیدۂ
دامن ز سبزہ چیدۂ تا بفلک رمیدۂ

از لوح خویش باز پرس قصۂ جور ہائے ما
آخر جوابِ ناسزا از لبِ ما شنیدۂ

با من مگو کہ مثلِ گل ہم وارہ شاخ بستہ باش
مانندِ موجِ بُو مرا آوارہ آفریدۂ

ہنگامۂ دیر یک طرف شورشِ کعبہ یک طرف
از آفرینشِ جہاں دردِ سرے خریدۂ

ہستیم ما گدائے تو یا تو گدائے ما ستی
بہرِ نیاز سجدۂ در پسِ ما دویدۂ

اُفتی اگر بدستِ ما حلقہ بگردِ تو کشیم
ہنگامہ گرم کردۂ خود از میان رمیدۂ

اقبال غربتِ توام نشتر بدل ہمی زند
تو در ہجوم عالمے یک آشنا ندیدۂ

اقبال کے بارے میں اپنے تجربات اور معلومات کا صحیح اور مکمل خاکہ پیش کرتے وقت میں صرف اپنی یادداشت پر اعتماد نہیں کرنا چاہتی اور چونکہ وہ اوریجنل خطوط جو میں نے یورپ سے اپنی بہنوں کے نام واقعات کے ذاتی ریکارڈ کی حیثیت سے پرائیویٹ ڈائری کی صورت میں بھیجے تھے آسانی سے مل گئے ہیں ۔ اس لیے میں روزمرہ کی وہ باتیں بیان کرنے کے قابل ہو

گئی ہوں جن سے ان امتیازی کیفیات، ذہنی رجحانات اور بعض مخصوص خصائص کی تشریح ہو جاتی ہے جنہوں نے یورپ میں زمانۂ طالب علمی میں اقبال کی شخصیت کی تعمیر کرنے میں مدد دی تھی۔

پہلی اپریل ۱۹۰۷ء کے لئے مس بیک نے انہی کے الفاظ میں مجھے "ایک مخصوص دعوت نامہ" بھیجا تاکہ میں ایک ذہین اور طباع طالب علم سے ملاقات کروں جن کا نام محمد اقبال ہے جو کیمبرج سے خاص طور پر مجھ سے ملنے کے لئے آ رہے ہیں۔ اس دعوت نامہ نے میرے لئے قدرے دلچسپی پیدا کر دی اس لئے کہ اس سے قبل میں نے اقبال کا نام بھی نہ سنا تھا اور چونکہ لندن میں مختلف ہندوستانیوں کے پاس سے میرے پاس ایسے دعوت نامے آیا کرتے تھے اس لئے اس دعوت نامے نے عارضی شوقِ تجسس سے زیادہ اور کوئی جذبہ پیدا نہیں کیا۔ مگر چونکہ مس بیک لندن کے مقیم ہندوستانی طلبا کی بہبودی کی نگران تھیں اور ان سے مادرِ مشفق کا سا برتاؤ کرتی تھیں اس لئے ان کے حکم کی تعمیل لازمی تھی۔ کھانے کی میز پر جو گفتگو ہوئی اس سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ اقبال فارسی اور عربی کے علاوہ سنسکرت میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے ہیں، بہت بڑے حاضر جواب ہیں اور دوسرے کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے اور حاضرین پر مزاحیہ فقرے کسنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ مس بیک نے ان کے آنے سے پہلے یہ حقیقت ذہن نشین کر دی تھی کہ وہ صرف مجھ سے ملنے کے لئے آ رہے ہیں اور چونکہ میں نے سیدھی سادی اور بے لاگ فطرت پائی تھی اس لئے میں نے اقبال سے پوچھا کہ اس ملاقات کی وجہ کیا ہے۔ ان کی عمیق

آنکھوں سے یہ ظاہر نہ ہو سکا کہ آیا وہ تعریف یا تعریض سے کام لے رہے ہیں جب کہ انہوں نے کہا کہ "آپ لندن اور ہندوستان میں اپنے سفر کی ڈائری کے باعث بہت مشہور ہو چکی ہیں اور اس لئے میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں آپ سے ملاقات کروں۔" میں نے اُن سے کہا کہ "میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ آپ نے کیمبرج سے یہاں تک آنے کی زحمت صرف اس لئے گوارا کی کہ آپ مجھے ہدیۂ تحسین — پیش کریں لیکن مذاق کو بالائے طاق رکھئے اور بتائیے کہ اس کی تہ میں حقیقی مقصد کیا ہے؟" میری اس صاف گوئی اور روکھے پن پر وہ قدرے متعجب بھی ہوئے اور کہا، "میں آپ کو مسٹر اور مسز سید علی بلگرامی کی طرف سے دعوت دینے آیا ہوں کہ آپ کیمبرج میں اُن کی مہمان بنیں اور میرا مشن یہ ہے کہ میں بغیر کسی رکاوٹ کے آپ کی منظوری ان تک پہنچا دوں۔ اگر آپ انکار کر دیں گی تو اس ناکامی کا داغ مجھ پر رہے گا جسے میں نے آج تک کبھی قبول نہیں کیا اور اگر آپ دعوت منظور کر لیں گی تو آپ درحقیقت میزبانوں کی عزت افزائی کریں گی۔"

اقبالؔ کو حسب خواہش اپنے تئیں دلچسپ اور خوشگوار بنانے کا ڈھنگ خوب آتا تھا۔ سوسائٹی میں وہ بہت زندہ دلی کا ثبوت دیتے تھے اور حاضر جوابی میں یا تعریف کرنے میں وہ کبھی نہیں جھجکتے تھے۔ اگرچہ بسا اوقات ان کے مذاق میں طنز کا رنگ نمایاں ہوتا تھا۔ دورانِ گفتگو حافظؔ کا ذکر آ گیا اور چونکہ میں خود اس شاعرِ اعظم سے دلچسپی رکھتی تھی اس لئے میں نے اُن کے بہت سے برمحل اشعار سنائے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ خود اقبالؔ بھی حافظؔ کے بے حد

مدّاح ہیں۔ اُنہوں نے کہا، "میں جب حافظ کے رنگ میں ہوتا ہوں اس وقت اُن کی رُوح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میری شخصیت شاعر کی شخصیت میں گُم ہو جاتی ہے اور میں خود حافظ بن جاتا ہوں۔" اُنہوں نے ایک اور ایرانی شاعر کا ذکر کیا جسے ہندوستان میں کوئی نہیں جانتا اور مجھ سے کہا کہ "آپ بابا فغانی کے کلام کا ضرور مطالعہ کریں۔ اُن کی بہت کم تصانیف ہندوستان میں دستیاب ہوتی ہیں لیکن اُن کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے اس لئے کہ وہ ایک جُداگانہ زاویۂ نگاہ پیش کرتی ہیں۔" یہ ہیں اقبالؔ سے میری پہلی ملاقات کے تاثرات اور اس کے دوران ہم نے طے کر لیا کہ میں ۲۲ اپریل کو کیمبرج پہنچوں گی۔

اس کے چند دن بعد اقبالؔ نے مجھے فرانسکے ٹس میں جو لندن کا ایک مشہور فیشن ایبل ہوٹل ہے، رات کے کھانے پر مدعو کیا تاکہ میں چند جرمن فضلا سے ملوں جن کے ساتھ مل کر وہ کام کر رہے تھے۔ اس ڈنر کے موقع پر ہر چیز نہایت قرینہ اور نزاکت سے سجائی گئی تھی اور جب میں نے اس کی تعریف کی اور داد دی تو اقبالؔ نے کہا کہ "میں دو شخصیتوں کا مجموعہ ہوں ظاہری شخصیت کار آمد اور عملی ہے اور باطنی شخصیت خواب دیکھنے والے فلسفی اور صوفی کی سی ہے۔" ڈنر سے قطع نظر کرتے ہوئے، جو بہت ہی لذیذ تھا میری ذہنی طور پر بھی دعوت ہو گئی اس لئے کہ مجھے اقبالؔ سے اور جرمن فلسفیوں سے گہرے فلسفیانہ مسائل پر گفتگو کرنے اور بحث کرنے کا موقع مل گیا۔ اس دعوت کے جواب میں میں نے ۱۵۔ اپریل کو ان کے اعزاز میں ایک چھوٹی سی پارٹی کا انتظام کیا جس میں میں نے اپنے چند فاضل دوستوں کو بھی

مدعو کیا تھا۔ ان میں مس سلوسٹر اور مس لیوی جو لندن میں زبان اور فلسفہ کی طالبات کی حیثیت سے بہت مشہور تھیں اور ایم۔ بینڈلی اور ہیر میٹنر ڈاٹھ جو مشہور موسیقی دان تھے، خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ پارٹی میں بہت زندہ دلی کا اظہار کیا گیا اور جب اقبالؔ نے فی البدیہہ چند شعر موزوں کر کے سنائے تو ان خواتین نے بھی اسی انداز میں مزاحیہ اشعار سے جواب دیا اور اس طرح فضا میں شروع سے آخر تک علمی پھلجھڑیاں چھٹتی رہیں۔ ایک موقع پر میں نے اقبالؔ کے اشعار کو قلمبند کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے یہ کہہ کر روک دیا "یہ باتیں اسی قسم کے خاص موقع کے لیے ہوتی ہیں اور ان کا مشن اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب وہ زبان سے ادا ہو جاتی ہیں۔" ہمارے موسیقی دان دوستوں نے کلاسیکل موسیقی کا مظاہرہ کیا اور اس طرح جو تین گھنٹے وہاں صرف ہوئے، اُن کی یاد عرصۂ دراز تک دلوں کو گرماتی رہی۔

جیسا کہ پہلے طے پا چکا تھا ۲۲۔ اپریل ۱۹۰۷ء کو میں کیمبرج روانہ ہو گئی۔ میرے ہمراہ اقبالؔ اور شیخ (اب سر) عبدالقادر تھے۔ راستہ بھر یہ دونوں فاضل نہایت عالمانہ گفتگو میں مصروف رہے جس میں کبھی کبھی مذاق بھی ہو جاتا تھا۔ گفتگو کی نوعیت ایسی تھی جس سے میں بھی دلچسپی لیتی رہی یہاں تک کہ ہم دوپہر کو بارہ بجے سید علی بلگرامی کے دولت کدہ پر پہنچ گئے۔ اقبالؔ نے سید علی بلگرامی کے گھر والوں سے میرا تعارف اس طرح سے کرایا گویا کہ کوئی مقدس چیز ان کے سپرد کی جا رہی ہے اور پھر کہا "اگر زندگی میں مجھے کبھی ناکامی کا خطرہ پیش آیا تو وہ اس وقت تھا جب کہ میں مس فیضی سے ملا

جنہوں نے محض آپ کے احترام میں آپ کے دعوت نامہ کو رد نہ کر کے میری لاج رکھ لی" اور آخر میں اپنا ایک فارسی شعر پڑھ کر سنایا۔ دن بھر بڑی اچھی گفتگو ہوتی رہی اور جو لوگ بلگرامی کے مکان پر جمع تھے وہ سب ایک دوسرے سے عالمانہ مباحث کرتے رہے۔ کبھی کبھار اقبال تھکے ہوئے اور بے حس سے معلوم ہوتے۔ یہ کیفیت اس وقت ہوا کرتی تھی جب کہ وہ موقع کے منتظر رہتے تھے کہ پارٹی کے کسی شخص کے منہ سے کوئی بات نکلے اور وہ برق رفتاری سے اس کا جواب دیں۔ میں نے اقبال کی یہ خصوصیت پہلی مرتبہ یہاں محسوس کی اور اندازہ لگا لیا کہ جب کبھی وہ بے تعلق اور اچاٹ سے معلوم ہوتے ہیں تو فقط اس وقت جب کہ وہ ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لئے موقع کے متلاشی رہتے ہیں اور اس وقت ان کا جواب اتنا جلد اور غیر متوقع ہوتا ہے کہ فریق ثانی اس غیر متوقع اچانک پن سے کم سے کم تھوڑی دیر کے لئے تو ضرور ہٹ جاتا ہے۔ انہیں دیکھ کر مجھے ولیم گلیڈسٹون کی اور اُن کے طریقوں کی یاد تازہ ہو گئی جو وہ پارلیمنٹ کے ایوان میں برتا کرتے تھے۔ میں اسی شام کو لندن واپس آ گئی۔

پہلی جون ۱۹۰۷ء کو میں پروفیسر آرنلڈ کی دعوت پر پکنک کے لئے کیمبرج گئی۔ اس پکنک کا انتظام دریا کے کنارے ایک درخت کے نیچے کیا گیا تھا اور اس موقع پر بہت سے نامی فضلا جمع تھے۔ گفتگو ادھر ادھر کے عام معاملات پر ہوتی رہی اور اسے فلسفیانہ رنگ دینے کی غرض سے پروفیسر آرنلڈ نے موت و حیات کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ ہر شخص نے زیر بحث مسئلہ پر

اپنے خیالات کا اظہار کیا اور جب بحث نے غیر واضع رنگ اختیار کر لیا تو اس وقت پروفیسر آرنلڈ نے اقبالؔ سے مخاطب ہو کر کہا کہ "زیر بحث مسئلہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟" اقبالؔ نے جواب تک بالکل خاموش بیٹھے تھے طنزیہ متبسم سے جواب دیا، "زندگی موت کی شروعات ہے اور موت زندگی کی"۔ اس کے بعد بحث ختم ہو گئی۔

۹۔ جون ۱۹۰۷ء کو میں پروفیسر آرنلڈ کے یہاں کھانے پر مدعو تھی اور اقبالؔ بھی وہاں موجود تھے۔ پروفیسر آرنلڈ نے جرمنی میں ایک نایاب عربی مخطوطہ کی دریافت کا ذکر کیا جس کے بارے میں یہ معلوم کرنے کی ضرورت تھی کہ وہ کیا ہے؟ اور کہا: "اقبالؔ! میں تمہیں وہاں بھیجنے کا خیال کر رہا ہوں اس لئے کہ تم ہی اس ذمہ دارانہ کام کے لئے موزوں ترین شخص ہو۔" اقبالؔ نے معذرت کے لہجہ میں کہا: "میں اپنے استاد کے سامنے بالکل ہیچ کی حیثیت رکھتا ہوں۔" پروفیسر آرنلڈ نے جواب دیا: "مجھے پورا یقین ہے کہ شاگرد اپنے استاد سے آگے بڑھ جائے گا۔" اقبالؔ نے قدرے خشک مزاجی سے کہا: "اگر آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں تو میں اپنے استاد کی بات مانے لیتا ہوں اور ان کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔" پروفیسر آرنلڈ سمجھ گئے کہ اقبالؔ کا حقیقی مفہوم کیا ہے اور تصدیق کی کہ اس بارے میں اقبالؔ کو ان پر نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ یہ تمام باتیں ایسی شستگی کے ساتھ اور ایسے مہذب پیرایہ میں کی جا رہی تھیں کہ یہ دیکھنا موجب مسرت تھا کہ اعلیٰ پایہ کے ذہین اور طباع اشخاص ایک دوسرے

کے ساتھ کس پاکیزہ طریقے سے بحث کرتے ہیں۔

دوسرے دن اقبالؔ میرے یہاں آئے اور فلسفہ پر چند جرمن اور عربی کتابیں بھی ساتھ لائے۔ ان کے ہمراہ ایک جرمن پروفیسر بھی تھے۔ انہوں نے ان کتابوں سے چند اقتباسات پڑھ کر سنائے اور اس کے بعد بحث کا سلسلہ شروع ہو گیا جس میں ہم سب نے حصّہ لیا۔ بیچ میں تقابل کی غرض سے حافظؔ کی طرف اشارہ کرتے رہتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اقبالؔ پر فارسی کے کسی دوسرے شاعر کے مقابلہ میں حافظؔ کا رنگ زیادہ چڑھا ہوا ہے۔ اس لئے کہ وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے جس میں وہ ان کے خیالات کو پیش کر کے دوسرے فلسفیوں کے ساتھ ان کا مقابلہ نہ کرتے ہوں۔ پورے تین گھنٹے تک کتابیں پڑھی گئیں اور ان پر بحث ہوتی رہی اور انہوں نے کہا کہ "اس طریقہ سے پڑھنے اور بحث و مباحثہ کرنے سے میرے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور میرے معتقدات پختہ ہو جاتے ہیں"۔

۲۲۔ جون ۱۹۰۷ء کو میرے یہاں ایک تقریب کا انتظام کیا گیا تھا جس میں ممتاز اور نامور ہندوستانی اور انگریز شریک تھے۔ ڈاکٹر انصاری نے چند گانے سنا کر ہم کو محظوظ کیا۔ (لارڈ) سنہا کی صاحبزادیوں کموالا اور رمولا نے موسیقی سے مسرور کیا اور اقبالؔ نے چند مزاحیہ اشعار سنائے جو فی البدیہہ کہے گئے تھے اور جن میں ہر موجود اور اہم مہمان کے بارے میں ان کی خصوصیت کے متعلق مبالغہ آمیز طریقہ سے تبصرہ کیا گیا تھا جنہیں سن

ہم سب نے خوب ہی قہقہے اڑائے۔

ایک جرمن خاتون نے جس کا نام مس شولی تھا، ۲۷ جون کو مجھے ہندوستانی وضع کے ڈنر پر مدعو کیا۔ میں بہت خوش ہوئی اس لئے کہ لندن میں ہندوستانی وضع کے کھانے کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا اور میں نے فوراً دعوت کو منظور کر لیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ اقبال اسی کے یہاں رہتے ہیں اور انہی کے کہنے پر مس شولی نے میرے نام دعوت نامہ بھیجا ہے۔ کھانا جو بالکل ہندوستانی وضع کا تھا اور ہندوستانی خصائص پر مشتمل تھا، اقبال کی زیر ہدایت تیار کیا گیا تھا۔ اقبال نے مجھ سے کہا کہ وہ ہر قسم کے ہندوستانی کھانوں کا اہتمام کر سکتے ہیں لیکن مجھے دعوت دینے میں اُن کا حقیقی منشا یہ تھا کہ وہ مجھے وہ مقالہ پڑھ کر سنائیں جسے اُنہوں نے اپنی ڈگری کے لئے تیار کیا تھا۔ اقبال نے اسے تمام و کمال پڑھ کر سنایا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُنہوں نے اس کی تیاری میں کس قدر جانفشانی اور تحقیق سے کام لیا ہے۔ جب وہ پڑھ چکے تو اُنہوں نے میری رائے طلب کی اور جو کچھ میں نے کہا اُسے انہوں نے مقالہ میں شامل کرنے کی غرض سے قلمبند کر لیا۔ ابھی مشکل سے ہم نے یہ کام ختم کیا ہوگا کہ چند دوست آ گئے اور ان کی معیت میں ہم امپیریل انسٹی ٹیوٹ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کرنے کی غرض سے گئے۔ جہاں خاندان شاہی کے اراکین بھی موجود تھے۔ سوائے اقبال کے باقی سب کے لئے ان کی موجودگی دلچسپی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ اقبال ساری شام تھکے ہوئے اور پریشان سے معلوم ہوتے تھے اور جب اُنہوں نے

یہ جملہ کہا کہ "یہ سب مسرّت بخش تضیع اوقات تھا": تو میں نے اُسے سُن کر کہا کہ "اس ریمارک سے ان کی فطری اپچ (اوریجنیلیٹی) کا اظہار نہیں ہوتا۔"

۲۹۔جُون ۱۹۰۷ء کو لیڈی ایلیٹس کے یہاں فیشن ایبل پارٹی دی گئی جہاں اقبالؔ کو دیکھ کر مجھے قدرے اچنبھا ہوا جب میں ان سے مصروف گفتگو تھی عین اس وقت مس سمرد جینی واس جو نہایت قیمتی لباس میں ملبوس تھیں اور ضرورت سے زیادہ ہیرے جواہرات میں لدی ہوئی تھیں اور بھدّے طریقے سے بنی ٹھنی تھیں، ایک دم اندر آ گئیں۔ انسانیت کا یہ نمونہ انگلستان جاتے وقت میرا ہم سفر تھا۔ مس موصوف اپنے آپ کو تمام خوبیوں کا مجموعہ سمجھتی تھیں۔ مجھے اور ہر اس شخص کو جو اُن کی راہ میں آیا، کلیتاً نظر انداز کرتے ہوئے اور پیکرِ جذبات بنے ہوئے سیدھی اقبالؔ کے پاس پہنچیں اور اُن کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کہا "میں صرف آپ سے ملنے کے لئے آئی ہوں۔" اقبالؔ نے اس عزّت افزائی کا جو جواب دیا وہ یہ تھا: "یہ عدم اس قدر فوری اور اچانک ہے کہ مجھے تعجب ہوگا اگر میں اس کمرے میں سے زندہ باہر نکل سکوں گا۔"

۴۔جولائی ۱۹۰۷ء تک اقبالؔ نے "تاریخ دنیا" کا کام مکمل کر لیا تھا جو اُنھوں نے اپنے جرمن امتحان کے لئے لکھی تھی۔ اُنھوں نے سارا مسودہ مجھے پڑھ کر سُنایا اور جب میں نے بعض واقعات کے بارے میں اپنے خیالات پیش کئے تو اس کے جواب میں اُنھوں نے کہا "ہر شخص اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ سے واقعاتِ عالم پر نگاہ ڈالتا ہے اور میں بھی اسی مخصوص روشنی میں دنیا کی تاریخ کو دیکھتا ہوں۔" وہ علم کے مخزن تھے اور ان کی یادداشت

حیرت انگیز طریقہ پہ قوی تھی جس کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے، جو اُنہوں نے اس کتاب میں جمع کیے تھے۔ مس شولی نے پھر ہمیں ہندوستانی وضع کا کھانا کھلایا جسے اقبالؔ کی زیر ہدایت تیار کیا گیا تھا۔ چونکہ وہ ماہر منتظمۂ خانہ تھیں اس لئے وہ ہر نئے کھانے کو جو اُنہیں بتایا جاتا تھا بہت جلد سیکھ لیتی تھیں۔

فلسفیانہ مضامین سے دلچسپی بڑھتی گئی اور اقبالؔ نے میری دلچسپی کے پیش نظر ۱۳، ۱۴، ۱۵ جولائی ۱۹۰۷ء کی تاریخیں مقرر کیں تاکہ روزانہ دو گھنٹے تک فلسفہ کا مطالعہ کیا جائے۔ چنانچہ میں، اقبالؔ اور پروفیسر ہیرٹیک سینٹ جنہوں نے جرمنی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی تھی، آپس میں شاعری اور فلسفہ پر نہایت گہری دلچسپی کے ساتھ بحث کرتے۔ اقبالؔ تمام تر جرمن علوم و فنون کی تائید میں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ "اگر تم علم کے کسی شعبہ میں اپنی معلومات کو بڑھانا چاہتے ہو تو تمہارا منتہائے نظر جرمنی ہونا چاہیئے۔" اُنہوں نے پھر کہا کہ "دوسروں سے بحث کرتے وقت ایک نئی دنیا تمہارے سامنے آجائے گی اور میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اسی طریقے سے حاصل کیا ہے۔" دوسرے دن اقبالؔ نے مجھے اپنی پولٹیکل اکانومی کا اصل مسودہ تحفہ کے طور پر دیا۔ اور ساتھ ہی وہ مقالہ بھی جس پر اُنہیں ڈگری ملی تھی۔ بعد کو وہ جرمن زبان میں ترجمہ ہو کر شائع ہوا۔ اس فاضلانہ مقالے کی بدولت اُن کی ناموری، شہرت اور وقار میں بہت اضافہ ہو گیا۔

۲۳۔ جولائی ۱۹۰۷ء کو ایک علمی مذاکرہ ہوا جس میں بہت سے ہندوستانی

مقیم لندن شریک ہوئے تھے۔ ایک نوجوان ہندوستانی نے جس کا نام پرشوتم لال تھا، بڑے ولولے کے ساتھ وہ خطوط پڑھ کر سُنائے جو اس کے گھر والوں نے اسے بھیجے تھے اور پھر رسالہ "مخزن" سے چند گیت اور نظمیں پڑھ کر سنائیں اور حاضرین کو محظوظ کیا۔ یہ سب نظمیں حُبِ وطن اور آزادی سے متعلق تھیں اور اقبالؔ کے زورِ قلم کا نتیجہ تھیں۔ اُس نے کہا کہ "یہ ساری نظمیں شمالی ہند میں گھر گھر گائی جاتی ہیں۔ اقبالؔ کی ان قومی نظموں سے گھر، بازار اور گلیاں گونج رہی ہیں اور ان کی وجہ سے ہندوستان میں قومیت کا وہ احساس پیدا ہو گیا ہے جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔" تمام مجمع میں اس قدر جوش پھیلا ہوا تھا کہ سب نے "مخزن" کی مطبوعہ نظموں کو ایک ساتھ گانا شروع کر دیا اور سارا ہال اقبالؔ کے اشعار سے گونج اٹھا۔ جب ذرا جوش ٹھنڈا ہوا تو میں نے وہ خط نکالا جو اقبالؔ نے مجھے جرمنی سے بھیجا تھا۔ یہ جرمن زبان میں تحریر کیا گیا تھا اور جب وہ پڑھا جا چکا تو سب نے یہ کہہ کر اُس کی تعریف کی کہ وہ روانی اور ادبیت کا بہترین نمونہ ہے۔ پروفیسر آرنلڈ نے یہ کہہ کر مجھ سے وہ خط مانگ لیا کہ "اگرچہ اقبالؔ میرے شاگرد ہیں لیکن میں اُن کی تحریرات سے بہت کچھ سیکھتا ہوں۔" اُنہوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "تم بہت خوش قسمت ہو کہ اُنہوں نے تمہیں ایسا اہم خط بھیجا۔" اور مجھے یہ کہہ کر یقین دلایا کہ "میں اس قیمتی جرمن شاہکار کو اپنے عزیز ترین مجموعے میں بہ حفاظت رکھوں گا۔" یہ صورت حالات بہت نازک تھی اور میں اس عظیم المرتبت انسان کی درخواست کو رد نہ کر سکی اور اقبالؔ کا خط اُن کے حوالے کر دیا۔ جو دو

مسودے اقبال نے ۱۶۔ جولائی کو مجھے تحفہ کے طور پر دیئے تھے وہ بھی پروفیسر آرنلڈ کے پاس ہی رہ گئے۔ چونکہ پروفیسر موصوف نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ ان دونوں مسودات کو اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں اس لئے میرے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ ان کی درخواست کو منظور کر لوں۔

۱۶۔ اگست ۱۹۰۷ء کو پروفیسر آرنلڈ نے مجھے اپنے مکان واقع ومبلڈن میں مدعو کیا۔ ان کے گھر کے متعلق مشہور تھا کہ وہ بہترین گھر کی حیثیت رکھتا ہے ان کی ۹ سالہ لڑکی نے اپنی موجودگی سے زندہ دلی اور خوش طبعی کی فضا پیدا کر دی تھی اور ساتھ ہی اپنے والد کے فلسفیانہ وقار کو بھی پوری طرح قائم رکھا تھا۔ ایک فاضل جرمن خاتون مس اسٹریٹن بھی وہاں موجود تھیں۔ گفتگو زیادہ تر لندن میں میرے کام کے متعلق ہی ہوتی رہی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اپنا کام ختم کرتے ہی ہندوستان واپس چلی جاؤں۔ مگر پروفیسر آرنلڈ نے پُرزور طریقہ سے رائے دی کہ مجھے کچھ دن اور جرمنی میں اور خصوصیت کے ساتھ ہائیڈلبرگ میں بسر کرنے چاہئیں تاکہ فلسفہ کے متعلق میرے خیالات میں وسعت پیدا ہو۔ مس اسٹریٹن نے ان تمام امکانات کی تشریح کی جو جرمنی میں مہیا ہو سکتے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے خیالات اور قوت ادراک میں پھیلاؤ پیدا ہو سکتا ہے، اور کچھ اس طرح سے میرے دل پر ان فوائد کا نقش بٹھایا کہ میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس موقع کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے اپنے بھائی ڈاکٹر فیضی کی معیت میں جرمنی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس لئے کہ وہ خود بھی وہاں جانے کے خواہش مند تھے اور اس ملک میں ایک مرتبہ پہلے بھی جا چکے تھے۔

اور جرمن زبان سے واقف تھے۔ منجملہ بہت سی باتوں کے پروفیسر آرنلڈ نے اقبالؔ کے کارناموں سے بحث کی اور مجھے ان کی بہت سی اصل تحریریں دکھلائیں جن میں وہ خط اور قلمی نسخے بھی تھے جو مجھ سے لے لئے گئے تھے۔

اقبالؔ کو بظاہر میرے اس ارادہ کی اطلاع مل گئی تھی کہ میں جرمنی جا رہی ہوں جیسا کہ اُن کے خط سے معلوم ہوا جو لندن میں مجھے ۶۔ اگست ۱۹۰۷ء کو ملا تھا اور جس میں ان کتابوں کی فہرست درج تھی جو اُنہوں نے میرے مطالعہ کے لئے جمع کی تھیں اور ساتھ ہی ان مختلف شہروں اور عجائب خانوں کے نام بھی درج تھے جنہیں مجھے جرمنی کے زمانۂ قیام میں جا کر دیکھنا تھا۔ میں نے جواب میں لکھا کہ "میں نے لندن سے روانگی کی تاریخ ۱۹۔ اگست مقرر کی ہے۔ اس لئے کہ لندن میں جو ذمہ داریاں میں نے اپنے سر لے رکھی ہیں اُن سے سبکدوش ہونے کے انتظامات میری جانب سے اس وقت تک مکمّل ہو جائیں گے۔"

ہائیڈلبرگ جرمنی

جیسا کہ طے ہو چکا تھا میں ہندوستانی طلباء کے گروپ کے ساتھ جس میں میرے بھائی ڈاکٹر فیضی بھی شامل تھے، ۱۹۔ اگست ۱۹۰۷ء کو لندن سے روانہ ہو گئی اور دوسرے دن سہ پہر کو ۵ بجے ہائیڈلبرگ پہنچ گئی۔ پروفیسر اقبال جیسا کہ وہ مشہور تھے، ان اشخاص میں نمایاں طور پر قابل ذکر ہیں جو ہماری پیشوائی کے لئے آئے تھے۔ لندن کی فضا کے مقابلہ میں یہاں کی فضا اس قدر مختلف تھی کہ تھوڑی دیر کے لئے مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں ہندوستان میں اپنے ہی آدمیوں میں ہوں۔ بیگانہ ہونے کے باوجود جس بے تکلفانہ دوستی، یگانگت اور سچی مسرت کا اظہار ہماری آمد پر کیا گیا وہ ایسی تھی کہ تمام رواجی تکلفات خود بخود ختم ہو گئے اور باضابطہ تعارف کی ضرورت باقی نہ رہی۔ پذیرائی کرنے والوں میں چند خواتین بھی تھیں لیکن قابل ذکر پروفیسر ویگے ناسٹ اور سینے شل تھیں۔ یہ دونوں نہایت نوعمر اور نہایت حسین خواتین میری جائے قیام تک میری رہنمائی کر رہی تھیں۔ اقبال بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اور انہوں نے راستے میں کہا کہ

"جو کام مجھے کرنا ہے، وہ اب پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔"

جب ہم یونیورسٹی کے خوبصورت اور دل آویز باغ میں پہنچے تو وہاں قہوہ اور لذیذ کیک ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ باقی اشخاص اپنے اپنے ناشتہ کا انتظام خود کر رہے تھے اور اقبالؔ بھی انہی میں شامل تھے اور اس جگہ کی بے تکلف فضا میں وہ نہایت اطمینان کے ساتھ مختلف کاموں کو انجام دے رہے تھے۔ یہاں پر اقبالؔ حلم اور انکساری کا پُتلا بنے ہوئے تھے حالانکہ لندن میں وہ بے حد خود رائے اور خود پسند نظر آتے تھے۔ یہ دونوں خوبصورت نوعمر خواتین اقبالؔ کی استاد تھیں اور وہ انہی سے فلسفے اور دوسرے ادق مضامین میں سبق لیا کرتے تھے۔ یونیورسٹی کے کام کے علاوہ ہر طالب علم کے لئے لازمی تھا کہ کشتی رانی، کلاسیکل موسیقی، گانا، باغبانی، سائیکل چلانا، درختوں پر چڑھنا وغیرہ سیکھے اور جب انہیں یونیورسٹی کے نصاب تعلیم کے ساتھ ملا دیا جائے تو سارا نصاب نہایت دلچسپ چیز بن جاتا ہے۔ اقبالؔ کو بھی تمام شعبوں میں شرکت کرنی پڑتی تھی اور وہ ان سب میں ہوشمندانہ طریقہ سے دلچسپی لیتے تھے۔ البتہ دو چیزیں ایسی تھیں جن میں وہ پھسڈی رہا کرتے تھے۔ ایک تو یہ کہ ان کی آواز گانے کے لئے بالکل موزوں و مناسب نہ تھی اور دوسرے یہ کہ وہ حاضری میں وقت کی پابندی کبھی نہیں کرتے تھے۔ پروفیسران ان کی ان خامیوں کے وجوہ کو اچھی طرح سے سمجھتی تھیں۔ جس ایک چیز کا مجھ پر یہاں سب سے زیادہ اثر پڑا وہ یہ تھی کہ یونیورسٹی کے ہوسٹل کا انتظام جس میں ۱۰۰ سے زیادہ طلبا تھے ایک ۷۰ سالہ بوڑھی قابل احترام خاتون (فراپروفیسر ہیرن) کے ہاتھ میں تھا

جو اس عمر میں بھی ہائیڈلبرگ میں سب سے ہوشیار اور ماہر موسیقی خیال کی جاتی تھیں۔

اس فرحت بخش یونیورسٹی میں طلبا اور اساتذہ کے رہنے سہنے کا معیار یکساں تھا اور ان دونوں میں تمیز کرنا اس وقت تک مشکل ہوتا تھا جب تک کہ سبق لینے کا وقت نہ آجائے اور آپ ان لوگوں کی زبان سے جو اس یونیورسٹی میں پروفیسر تھے، دقیق فلسفیانہ مسائل کی تشریح نہ سنیں۔ طلبا کے مقابلہ میں پروفیسروں کے ساتھ یہ رعایت تھی کہ انہیں رہنے سہنے اور کھانے پینے کا کچھ دینا نہیں پڑتا تھا اور طلبا کو ان تمام سہولتوں کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی جو ان کے لئے فراہم کی جاتی تھیں۔ دن بھر کی باضابطہ تعلیم کے بعد ہم ٹہلتے ٹہلتے ایک قہوہ خانہ میں جا نکلے جو قریب ہی دریا کے کنارے واقع تھا اور طلبا کے گروپ نے دونوں نوعمر خواتین، پروفیسر فراویگے ناست اور فرالائن سینے شل سے جرمن، یونانی اور فرانسیسی فلسفہ پر بحث و مباحثہ شروع کر دیا۔ یہ لڑکیاں تینوں زبانیں جانتی تھیں اور میں محسوس کرتی تھی کہ وہ درحقیقت بحرالعلوم ہیں۔ جو کچھ وہاں کہا جاتا تھا۔ اقبال اُسے نہایت گہری توجہ اور انکساری کے ساتھ سنتے تھے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ سننے میں اس قدر محو ہو جایا کرتے تھے کہ جب سبق ختم ہو جاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی خواب سے بیدار ہوئے ہیں۔ یہاں ان کا طرزِ عمل لندن کے طرزِ عمل سے کس قدر مختلف تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جرمنی ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور وہ ان تمام درختوں سے جن کے پاس سے وہ گزرتے تھے اور اس گھاس

سے جس پر وہ چلتے تھے، علم کی خوشہ چینی کر رہے ہیں۔ فرالائن سیلنے شل جس طریقہ سے فلسفیانہ مسائل کی تشریح کرتی تھیں۔ وہ اقبالؔ کو بہت مرغوب تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کی تعلیمات سے رُوحانی فیض حاصل کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی جب اقبالؔ کے جوابات صحیح نہ ہوتے تو فرالائن سیلنے شل — ایسی نرمی سے اُن کی اصلاح کر دیتیں کہ اقبالؔ سکول کے بچے کی طرح اپنی انگلیوں کے ناخن کاٹنے لگ جاتے جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ انہوں نے وہ بات کیوں نہ کہی جو اُنہیں کہنی چاہیئے تھی۔ اقبالؔ کی سیرت کے اس پہلو سے میں پہلے واقف نہ تھی اس لئے کہ جو نک چڑھاپن ان میں لندن میں پایا جاتا تھا وہ یہاں بالکل عنقا تھا اور میں تعجب کرنے لگتی تھی کہ آیا جو کچھ میں نے لندن میں دیکھا ہے وہ صحیح بھی تھا یا نہیں۔

اس قسم کی تعلیم کے بعد ساری پارٹی ایک قریب کی پہاڑی پر پیدل چڑھی۔ اس پہاڑی کی چوٹی پر شلوس تک پہنچنے کے لئے ایک ہزار سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں اور پارٹی کے ہر فرد سے کہا گیا کہ وہ اس کی تاریخ بیان کرے۔ اقبالؔ نے جو کچھ بیان کیا وہ بالکل صحیح نکلا اور آخر میں اُنہوں نے کہا کہ وادی نیکر کا بہترین نظارہ یہیں سے کیا جا سکتا ہے۔ پہاڑی کی چوٹی پر ہم سب آپیرا گاتے ہوئے پہنچے تھے اور اس میں اقبالؔ نے بھی شرکت کی تھی مگر ان کی آواز ٹھیک طرح سے نہ نکلتی تھی اور وہ بالکل بے سُرے پن سے گا رہے تھے۔

۲۲۔ اگست ۱۹۰۷ء کا دن وہ دن تھا جس سے اس چھوٹی سی

کتاب کا آغاز کیا گیا ہے اور اس کے واقعات کی طرف حوالہ پہلے باب میں درج کر دیا گیا ہے۔ اسی دن کا واقعہ ہے کہ ایک پکنک پارٹی مطالعہ اور تفریح کے لئے ترتیب دی گئی تھی اور سب اسی مقصد سے تیار ہو کر آئے تھے۔ ہماری پارٹی بڑھتی گئی جوں جوں ہم پکنک میں شریک ہونے والوں کو ان کے گھروں سے لیتے گئے۔ اقبالؔ کی جائے قیام راستہ میں تقریباً سب سے آخر میں تھی اور جب ہم وہاں پہنچے تو انہیں حالت انتظار میں پانے کی بجائے اس حالت استغراق میں دیکھا جس کا ذکر کتاب کی ابتدا میں کیا گیا۔ اس صورت حال نے ان لوگوں میں کھلبلی سی مچا دی جو وہاں جمع ہوئے تھے۔ اور کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ان تک جائے! اس لئے کہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس مداخلت کے نتائج کیا ہوں گے۔ فرا پروفیسر میرے پاس آئیں اور پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ اگرچہ کسی حد تک میں خود اس نظارے سے متاثر تھی لیکن صورت حالات تفریح سے خالی نہ تھی۔ چنانچہ میں اس میز تک پہنچی جہاں اقبالؔ حالت استغراق میں گرد و پیش کے واقعات سے بالکل بے خبر بیٹھے تھے۔ جب وہ میرے پکارنے پر بھی نہ بولے تو میں نے فرا پروفیسر کی مدد سے انہیں جھنجھوڑا اور اس وقت ان میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے اور انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا کہ انہیں کیوں پریشان کیا جا رہا ہے۔ میں نے اردو میں جھڑک کر کہا کہ وہ اس وقت روحانیت سے معرّا جرمن شہر میں ہیں اور ہندوستان میں نہیں ہیں جہاں اس قسم کی خرافات کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اقبالؔ آپے میں آ گئے اور تفریحی

پارٹی میں شامل ہوئے اور سب معاملات ٹھیک ٹھاک ہو گئے۔ سیر و تفریح کے دوران مجھے کچھ لمحات کے لئے تنہائی کا موقع ملا جس میں میں نے اس روحانی نمائش کے بارے میں اپنے دلی خیالات کا اظہار کیا۔ جب میں اقبال سے باتیں کر رہی تھی اس وقت پارٹی میں سے ایک نے ہمارا فوٹو لے لیا۔

ہم اپنے سفر پر گامزن تھے کہ فرالائن ویگے ناست نے یکایک ہندوستانی گانا گانا شروع کر دیا جسے میں نے گزشتہ رات سکھایا تھا۔ "گجرا بیچن والی ناداں یہ تیرا نخرا۔" اس گیت میں سب شامل ہوئے اور معلوم ہوتا تھا کہ یہ سرود خوانوں کا نغمہ ہے۔ سب گاتے جاتے تھے اور ہار بنانے کے لئے جنگلی پھولوں کو توڑتے جاتے تھے۔ یکایک پارٹی رک گئی اور تفریح و تفنن کے طور پر وہ ہار اقبال کے سر کے گرد یہ کہہ کر لپیٹ دیئے گئے کہ "ہم آپ کو نامعلوم دنیا کی بادشاہت کا تاج پہناتے ہیں۔"

پہاڑی کی چوٹی پر ایک ہوٹل تھا جو ہماری منزل مقصود تھا۔ یہ علاقہ گرانڈ ڈیوک آف ہیس کے کنٹری ہوم میں شامل تھا۔ ۲۳۔ اگست ۱۹۰۷ء کا دن ایک غیر معمولی سیر سپاٹے کے لئے مقرر کیا گیا تھا جس کا مقصد خالصتاً تعلیمی تھا۔ اقبال سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس پارٹی کے رہنما بنیں اور مقصود یہ تھا کہ وہ چلتے چلتے مختلف مقامات کے بارے میں تاریخی واقعات بتاتے جائیں اور جہاں وہ غلطی کریں دوسرے طلبا ضروری معلومات بہم پہنچا دیں۔ اس طریقہ سے ہم ایک جگہ پہنچے جس کا نام کونگ اسٹال (بادشاہ کا قدمچہ) تھا۔ اس پر اقبال خود جا کر بیٹھ گئے اور اردو میں مزاحیہ اشعار سناتے رہے۔

جب جرمن طلبا نے پوچھا کہ ان اشعار کا مطلب کیا ہے تو اقبال نے کہا "نادیدہ خدا کی طرف سے مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں آپ کو آسمانی زبان میں حکم دوں کہ آپ ایک مہیب سرکل بنائیں اور پھر فرشتوں کا نغمہ سنائیں"۔ اس حکم کی فوری تعمیل کی گئی اور جرمن اوپیرا کا ایک حصہ سب نے مل کر نہایت عمدہ طریقے سے گا کر سنایا۔ اس کے بعد ہم کوہ لوف کی طرف چلے جو وہاں سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ باغ کسی زمانے میں شاہی تفریح گاہ تھا اور اس کی مثال ایک ایسے ہیرے کی سی تھی جس کے ارد گرد خوبصورت زمرّدین رنگ کا گھیرا ہو۔ تمام تاریخی واقعات اور اس کے خوبصورت پہلوؤں کا حال سننے کے بعد ہم یونیورسٹی ہوسٹل میں واپس آ گئے اور یہ فیصلہ کیا کہ کل کا دن صرف سوال و جواب کے لئے وقف رہے گا۔ اس دن ایسے ایسے عجیب غریب اور پیچیدہ سوال پوچھے گئے جن میں سے بعض کے جوابات ہی نہ تھے اور اس لئے وہ بغیر جواب کے رہ گئے۔

۲۵ ویں اگست کا دن باغ فردوس کی سیر کے لئے مقرر کیا گیا جس میں کسی بادشاہ نے تمام ممالک کی عبادت گاہیں جن میں ایک مسجد بھی تھی، تعمیر کی تھیں۔ باغ آبشاروں، جھیلوں، خوبصورت شہ نشینوں اور پھل دار اور پھول دار درختوں کے بیچ میں بنایا گیا تھا اور اس میں پرندوں کے رہنے کے لئے بھی خاص طور سے انتظام کیا گیا تھا۔ جس عمارت کو مسجد بنایا سجایا تھا وہ بہت دلکش اور اثر ڈالنے والی تھی اور اس پہ ہر جگہ لفظ اللہ عربی میں کندہ تھا۔ اس کے علاوہ مختلف سورتوں کی کچھ آیات بھی کندہ تھیں۔ ہر شخص یہ جاننے کا

خواہشمند تھا کہ ان تحریرات کا مطلب کیا ہے۔ اس پر اقبالؔ نے نہایت سنجیدگی سے عربی کتبوں کو پڑھا اور ہمیں بتایا کہ اس جگہ کی تاریخ کیا ہے۔ اقبالؔ نے کہا کہ "جس بادشاہ نے یہ جگہ تعمیر کی تھی اُسے اتفاق سے ایک حور مل گئی اور وہ یہ چاہتا تھا کہ اس سے شادی کرے۔ حور نے کہا کہ میں آپ کی ملکہ بننے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ آپ مُسلمان ہو جائیں اور ایک مسجد تعمیر کریں جہاں ہمارا نکاح پڑھا جائے گا۔ بادشاہ نے اُس کا کہنا مان لیا اور مسجد کی تعمیر کا حکم دے دیا جو اب تک موجود ہے اور یہیں ان کا نکاح پڑھا گیا۔" اقبالؔ نے یہ سارا قصّہ کچھ ایسی سنجیدگی سے بیان کیا کہ ہم اندازہ نہیں کر سکے کہ اس کے بارے میں کیا کہیں۔ بلاشبہ ہم ہندوستانی یہ قصّہ سُن کر خوب ہنسے اور سمجھ لیا کہ یہ سارا قصّہ بناوٹی ہے۔ لیکن اقبالؔ نے شروع سے آخر تک جس سنجیدگی کا اظہار کیا اس سے باقی اشخاص نے بالضرور یہ یقین کر لیا کہ یہ سارا واقعہ تاریخی ہے۔

۲۸ ویں اگست ۱۹۰۷ء کا دن میونک میں بسر ہوا۔ جرمنی کے تمام شہروں میں اقبالؔ میونک ہی کو سب سے زیادہ پسند کرتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اُنہوں نے اپنے ابتدائی اسباق وہیں پر ہیر پروفیسر رین کی حسین صاحبزادی کے زیرِ ہدایت لئے تھے۔ اقبالؔ میونک کو "جزیرۂ مسرّت" کے نام سے یاد کرتے تھے جسے "تخیّل کے سمندر میں غسل دیا گیا ہو"۔ میونک کے بہت سے مقامات دیکھنے کے بعد ہم پروفیسر رین کے گھر گئے اور چند رسمی باتوں کے بعد نوجوان حسینہ فرالائن رین نے اقبالؔ کا امتحان لینا شروع

کیا یہ دیکھنے کے لیئے کہ فلسفہ میں اُنہوں نے میونک چھوڑنے کے بعد کتنی ترقی کی ہے۔ میں اُن کے علم کی وسعت، کو دیکھ کر ششدر رہ گئی اور میں نے دیکھا کہ بسا اوقات وہ اقبالؔ کو ان کی غلط روی پر ٹوک دیتی تھیں اور نہایت شفقت کے ساتھ انہیں ڈانٹ بھی پلاتی تھیں۔ میری حیرانی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ میں نے دیکھا کہ یہ حسینہ پیانو کے پاس گئی اور نہایت استادانہ طریقہ سے کلاسیکل موسیقی کا مظاہرہ کیا اور اقبالؔ سے پوچھا کہ "بتاؤ، میں کیا گا رہی ہوں"۔ اقبالؔ اس کے سامنے بالکل کھوسے گئے اور وہ فن موسیقی کے کمالات سے سب کو بے خود بناتی گئی۔ وہ علم کی ہر شاخ میں ید طولیٰ رکھتی تھی، قطع نظر اس کے کہ وہ خود بھی فطرت کا ایک شاہکار تھی۔ یہ سلسلہ پورے تین گھنٹے رہا اور مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اقبالؔ نے اسی کی زیر ہدایت وہ علمی مقالہ تیار کیا تھا جس پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ میونک کی "فنشنگ ٹچ" نہایت اثر انداز تھی اور ہم پھر ہائیڈلبرگ واپس آ گئے۔

ہائیڈلبرگ، ۳۰۔ اگست ۱۹۰۷ء — آج کے دن کشتی رانی کی ریس کا انتظام کیا گیا اور یہ بہت ہی پُرلطف نظارہ تھا۔ ہر ایک نے اس ریس میں حصّہ لیا۔ اس بازی میں اقبالؔ نے سب سے پیچھے رہ کر اپنے کمال کا مظاہرہ کیا یہاں تک کہ میں بھی اُن سے آگے نکل گئی۔ شام کا وقت علمی مذاکرہ میں صرف ہوا اور ان تین گھنٹوں میں ساری دنیا کھنگال ڈالی گئی۔

۳۱۔ اگست کا دن مشہور و معروف شلوس نیکر بینس ٹین کو دیکھنے کے لیئے مقرر کیا گیا تھا جو کچھ فاصلہ پر بہت بلندی پر واقع تھا۔ وہاں تک

پہنچنے کے لیئے حسین وادی نیکر میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس کے گردا گرد پھل دار درختوں کا جنگل اگا یا گیا تھا اور یورپ کے جتنے پھلوں کا آپ تصوّر کر سکیں وہ سب وہاں موجود تھے۔ اس باغ کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا دریا بہتا تھا جس میں کہیں کہیں آبشار بھی تھے جن کی وجہ سے جنت الفردوس کا سماں بندھ جاتا تھا۔ اس باغ میں آنے والے اشخاص کے لیئے کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی۔ ہم ان تمام پھلوں اور پھولوں سے لطف اندوز ہوئے جو فطرت کی جانب سے ہمیں پیش کیئے گئے تھے اور ساری پارٹی اس درجہ مسرور ہوئی کہ پورا لطف اٹھانے کی تجویز کی گئی کہ پھولوں کے تاج پہن کر ناچا جائے۔ فرا پروفیسر ویگے ناسنت نے ابتدا کی۔ وہ اقبال کے ساتھ اپنے ملک کا دیہاتی ناچ ناچیں جس میں دوسرے طلبا بھی شامل ہو گئے۔ اقبال اس فن میں بہت کچے تھے اور اس لیئے ان کے ناچ کو دیکھ کر بہت ہنسی اڑی۔ سب لوگ ایک خوش و خرّم گھرانے کے افراد معلوم ہوتے تھے۔ اس تفریح کے ساتھ ساتھ نئی نئی باتیں سیکھنے اور دقیق سوالات کا جواب دینے کی وجہ سے اس ظاہری تفریح و تفنن کا معیار بہت بلند رہا۔

اس طریقے سے ہمارا روز کا پروگرام بہت بھرا رہتا تھا اور اس میں نئے نئے مقامات کی سیر، نئے نئے کھیل، نئے نئے اسباق اور اس قسم کے واقعات جن کا میں اب ذکر کرتی ہوں وغیرہ امور سب شامل تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فرالائن ویگے ناسنت، فرالائن سینے نشل اور فرالائن گیبدنات جسمانی کلچر کی ورزشوں میں مصروف تھیں اور فرالائن ویگے ناسنت کی بانہہ

ورزش کی ضروریات کے مطابق مجھے اپنے حلقہ میں لئے ہوئے تھی۔ ہم کام میں مشغول تھیں کہ اتنے میں اقبالؔ آ گئے اور آن کر ہمارے سامنے کھڑے ہو گئے اور ہمیں گھورنے لگے اور پھر بُت کی طرح ساکت کھڑے ہو گئے۔ جب فرالائن پروفیسر ویگے ناست نے پوچھا کہ وہ اس طرح سے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں تو اُنہوں نے فی الفور جواب دیا "میں یکایک ہیئت دان بن گیا ہوں اور اس لئے میں تاروں کے اس جھرمٹ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔" اسی شام کو رات کے کھانے پر ہمارے یہاں ایک مہمان آئیں جن کے بال بہت خوبصورت اور سنہری تھے اور چونکہ وہ بہت نوعمر تھیں اس لئے ان کے رخساروں پر نرم نرم سنہری روئیں زیادہ نمایاں تھے۔ اقبالؔ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے اُردو کا یہ شعر پڑھا ؎

اس کے عارض پر سنہری بال ہیں
ہو طلائی اُسترا اس کے لئے

بذلہ سنجی کے اس ہمہ گیر مظاہرہ پر میں کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

میری سیاحت اب ختم ہونے کے قریب آ گئی تھی اور میں ہائیڈلبرگ سے دوسرے دن روانہ ہونے والی تھی۔ جب کہ بہت سے دلچسپ قصّے ہوئے۔ اسپیئر ہاف کے مشہور و معروف پھلوں والے باغ میں ہمارا اجتماع ہوا اور ہر ایک نے ایک ایک وضع کا کھانا تیار کیا اور اقبالؔ نے بھی ہندوستانی وضع کا کھانا پکایا۔ ہر کھانے پر تنقید کی گئی، اچھی یا بُری اور جب میری روانگی کا وقت آیا سب قطار میں کھڑے ہو گئے اور مجھے

سب سے آگے کھڑا کر دیا گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کسی نے میرے اعزاز میں الوداعی نظم بھی لکھی تھی جسے اقبالؔ نے گا کر سنایا اور اس میں سب شریک ہوئے۔ اس طرح میری جرمنی کی سیاحت پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

میں ہندوستان واپس آگئی اور اس کے بعد اقبالؔ سے ملنے کا کوئی موقع نہ مل سکا۔ لیکن میرے نام ان کے بہت سے خطوط آتے جن کے جوابات میں دیتی رہی اگرچہ ان کا ریکارڈ میرے پاس محفوظ نہیں رہا۔ ۱۹۰۸ء میں مجھے اپنی بہن اور بہنوئی ڈیڑھ ہائی نیسز نواب سیدی احمد خاں اور رفیعہ سلطان نازلی بیگم آف جنجیرہ کی معیت میں پھر یورپ جانے کا اتفاق ہوا۔ اقبالؔ ڈیڑ ہائی نیسز سے ملنے کے لئے تشریف لائے اور میری بہن کی آٹوگراف البم میں ۹۔ جون ۱۹۰۸ء کو ذیل کی نظم لکھ کر دی:۔

اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر

اور فیضِ آستاں بوسی سے گُل بر سر قمر

روشنی لے کر تری موجِ غبارِ راہ سے

دیتا ہے لیلائے شب کو نور کی چادر قمر

کاروانِ قوم کو ہے تجھ سے زینت اس طرح

جس طرح گردوں پہ صدرِ محفلِ اختر قمر

شمعِ بزمِ اہلِ ملّت را چراغِ طور کُن

یعنی ظلمت خانۂ مارا سراپا نور کُن

اُسی سال ہم ہندوستان واپس آ گئے۔ اس وقت میری والدہ بہت بیمار تھیں اور بالآخر اسی بیماری میں انتقال کر گئیں۔ اس صدمے کی خبر اقبالؔ کو بھی دی گئی تھی اور انہیں لکھا گیا تھا کہ اسی وجہ سے ان کے بہت سے خطوط کا جواب نہیں دیا گیا۔ ذیل کی نظم ان بہت سی نظموں میں سے ایک ہے جنہیں اقبالؔ نے میرے نام بھیجا تھا ؎

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے

خود تڑپتا تھا چمن والوں کو تڑپاتا تھا میں
تجھ کو جب رنگیں نوا پاتا تھا شرماتا تھا میں

میرے پہلو میں دلِ مضطر نہ تھا سیماب تھا
ارتکابِ جرمِ اُلفت کے لئے بیتاب تھا

نامرادی محفلِ گل میں مری مشہور تھی
صبح میری آئینہ دارِ شبِ دیجور تھی

از نفس در سینۂ خوں گشتہ نشتر داشتم
زیرِ خاموشی نہاں غوغائے محشر داشتم

اب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں
اہلِ گلشن پر گراں میری غزل خوانی نہیں

عشق کے کانٹے سے لالے بن گئے چھالے میرے
کھیلتے ہیں بجلیوں کے ساتھ اب نالے میرے

غازۂ اُلفت سے یہ خاک سیہ آئینہ ہے
اور آئینے میں عکسِ ہمدم دیرینہ ہے
قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی
دل کے لٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی
ضو سے اس خورشید کے اختر میرا تابندہ ہے
چاندنی جس کے غبارِ راہ سے شرمندہ ہے
یک نظر کردی و آدابِ فنا آموختی
اے خنک روزے کہ خاشاکِ مرا واسوختی

میونک (جرمنی) دُور افتادہ اقبالؔ

میں نے ویرنائی بینسز کی طرف سے انہیں جنجیرہ آنے کی دعوت دی تھی۔ ۱۳۔ جنوری کو جو جواب انہوں نے دیا وہ حسب ذیل ہے:

لاہور ۱۳۔ جنوری ۱۹۰۹ء

مائی ڈیر مس عطیہ!

آپ کے نوازش نامے کا بہت بہت شکریہ جو مجھے ابھی ملا ہے۔ اور جسے پڑھ کر مجھے بہت سکون ملا۔ میرا خیال تھا کہ اظہارِ تعزیّت کے لیے خود بمبئی آؤں لیکن بد قسمتی سے ۲۹۔ دسمبر کو جب کہ میں ایک کانفرنس کے مباحث میں مصروف تھا، مجھے گھر سے تار ملا جس میں میرے بھائی کی شدید علالت کا ذکر تھا اور اس لئے مجھے اسی سہ پہر کو بہ عجلت تمام سیالکوٹ بھاگنا پڑا۔ چھٹیوں کے باقی ماندہ ایّام ان کی تیمارداری کی نذر ہو گئے۔ خوش قسمتی سے وہ اب

بالکل اچھے ہو گئے ہیں۔ خدا نے انہیں میری خاطر نئی زندگی بخشی ہے۔ میں ان کا اس قدر روپیہ صرف کر چکا ہوں اور اب بھی خرچ کر رہا ہوں۔ ان کی موت میرے لئے ہر نقطۂ نظر سے بڑی خوفناک ہوتی۔

ویئر ہائی نیسز اور آپ کی غایت درجہ کی مہربانی ہے جو آپ نے مجھے جنجیرہ آنے کی دعوت دی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز ذہنی اور جسمانی اعتبار سے زیادہ دل خوش کن اور سود مند نہیں ہو سکتی۔ لیکن آپ واقف ہیں کہ میں نے ابھی ابھی اپنی پریکٹس شروع کی ہے جس کے لئے یہاں پر میری مسلسل موجودگی کی ضرورت ہے۔ دوسروں کی خاطر مجھے آپ کی رفاقت کی مسرت سے دست بردار ہو جانا چاہئے باوجود اس کے کہ میرے دل میں ایک زبردست، تقریباً نہ دبنے والی خواہش، موجزن ہے کہ میں آؤں اور جو صدمہ حال میں آپ کو پہنچا ہے اس پر غالب آنے میں میں آپ کی اور آپ کی ہمشیرہ کی امداد کروں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اس بارے میں آپ کی تھوڑی بہت خدمت کر سکتا ہوں۔ لیکن میں مجبور ہوں کہ میں اپنی موجودہ حالت میں اپنے اندرونی جذبات کو ان قابلِ لحاظ امور کی خاطر دبا دوں جن کی قوت اور زیادہ شدید طریقہ سے اپنے آپ کو محسوس کرا رہی ہے۔

براہِ کرم اس ذرا سی دنیاوی سمجھ داری کے لئے آپ مجھے ناپسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھیں جو بلاشبہ اس وقت حماقت کا درجہ رکھتی ہے جب کہ ہم شاعری کی دنیا میں ہوتے ہیں۔ اس لئے زمانۂ قریب میں میرے لئے جنجیرہ آنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس کا امکان ہے کہ میں ستمبر کی تعطیلات میں

آپ سے ملنے کی کوشش کروں جب کہ چیف کورٹ بند رہتی ہے۔ ڈیئر ہائی نیسز اور آپ کی معیت میں کچھ وقت صرف کرنا ذہنی دعوت اور دلی مسرت دونوں کا مجموعہ ہے۔ براہِ کرم میرا نہایت موڈبانہ سلام ان کی خدمت میں پہنچا دیجئے اور انہیں ایک دُور افتادہ دوست کی بہترین خواہشات کا یقین دلا دیجئے جس کے حالات اسے اس کے تخیل سے محروم نہیں کر سکتے اگرچہ اُنہوں نے اسے ظالمانہ طریقہ سے آپ سے اور ڈیئر ہائی نیسز سے ملاقات کرنے کے فوری مواقع سے محروم کر دیا ہے۔

آپ کا ہمیشہ کا صادق

ایس۔ ایم۔ اقبال۔ بار ایٹ لاء

مکرر:۔

ایرانی فلسفۂ مابعد الطبیعات پر میری کتاب شائع ہو گئی ہے میں بہت جلد آپ کو اس کا ایک نسخہ بھیجوں گا۔ غزلیات کو بھی میں بہت جلد شائع کر رہا ہوں۔ وہ ہندوستان میں چھپیں گی۔ ان کی جلد بندی جرمنی میں ہو گی اور ان کا انتساب ہندوستانی خاتون کے نام ہو گا۔

میں نے سنا تھا کہ اقبال نے علی گڑھ یونیورسٹی کی پیش کردہ فلسفے کی پروفیسری کو منظور کرنے سے انکار کر دیا ہے اور اس لئے میں نے اُن سے انکار کی وجہ دریافت کی۔ مجھے علی گڑھ یونیورسٹی سے دلچسپی تھی اور میں نے مختلف طریقوں سے اس درسگاہ کی خدمت بھی کی تھی اور چونکہ مجھے اقبال کے دلی خیالات سے واقفیت تھی اس لئے میں نے محسوس

کیا کہ اُنہیں ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی مقصد کو ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہیئے اور فی الحقیقت ہماری قوم کو ایسی ہی سستی کی ضرورت تھی۔ اُن کے انکار سے مجھے بہت رنج ہوا اور میں نے اس مسئلہ پر انہیں خط لکھا۔ ذیل کا خط مورخہ ۹۔ اپریل ۱۹۰۹ء میرے خط کے جواب میں موصول ہوا:۔

لاہور، ۹۔ اپریل ۱۹۰۹ء

مائی ڈیر مس شیفی!

آپ کے نوازش نامے کا بہت بہت شکریہ جو آج ہی صبح مجھے ملا۔ میں آپ کو نہیں بتا سکتا کہ مسٹر میر محمد کون ہیں۔ غالباً آپ ان کو نہیں جانتیں، لیکن آپ ان کی بیوی سے واقف ہیں اور مجھے امید ہے کہ اب آپ اُنہیں پہچاننے کے قابل ہو جائیں گی۔

ہاں! میں نے علی گڑھ کی فلسفہ کی پروفیسری قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور چند دن ہوئے میں نے لاہور گورنمنٹ کالج میں تاریخ کی پروفیسری قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ میں کسی قسم کی ملازمت کرنا نہیں چاہتا میرا مقصد یہ ہے کہ میں جلد سے جلد اس ملک سے بھاگ کر کہیں چلا جاؤں۔ آپ کو اس کی وجہ معلوم ہے۔ میں اپنے بھائی کا ایک قسم کا اخلاقی قرض دار ہوں اور یہی چیز مجھے روک رہی ہے۔ میری زندگی سخت مصیبت بنی ہوئی ہے۔ وہ مجھ پر کوئی سی بھی بیوی زبردستی منڈھ دینا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنے والد کو لکھ دیا ہے کہ انہیں میری شادی ٹھہرانے کا کوئی حق نہیں تھا بالخصوص جب کہ میں نے اس قسم کے تعلق میں پڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں اس کی کفالت

کرنے پر بالکل رضامند ہوں، لیکن میں اُسے اپنے ساتھ رکھ کر اپنی زندگی کو اجیرن بنانے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ انسان ہونے کی حیثیت سے مجھے مسرّت اور خوشی حاصل کرنے کا حق ہے۔ اگر سوسائٹی مجھے وہ حق دینے سے انکار کر دے تو میں دونوں کا کھلم کھلا مقابلہ کروں گا۔ واحد علاج یہ ہے کہ میں اس بدبخت ملک کو چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں یا پھر شراب نوشی میں پناہ لوں جو خودکشی کو آسان بنا دیتی ہے۔ کتابوں کے یہ مُردہ بنجر اوراق مجھے مسرّت نہیں دے سکتے۔ میری رُوح میں کافی آگ پنہاں ہے جو انہیں جلا سکتی ہے اور تمام سماجی رسوم کو بھی۔ آپ کہیں گی کہ ایک اچھے خدا نے یہ تمام چیزیں پیدا کی ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر اس زندگی کے واقعات ایک مختلف نتیجہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ کسی اچھے خدا کی بجائے ذہنی طور پر کسی قادرِ مطلق شیطان پر یقین لے آنا زیادہ آسان ہے۔ براہِ کرم ان خیالات کے اظہار کے لئے معاف کیجئے گا۔ میں ہمدردی کا خواستگار نہیں ہوں۔ میں تو صرف اپنی رُوح کے بوجھ کو اتار دینا چاہتا تھا۔ آپ میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں اور اسی وجہ سے میں نے اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی جرأت کی ہے۔

مجھے امید ہے کہ آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ میں نے ملازمت کرنے سے کیوں انکار کر دیا۔

مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں آپ کے لئے کسی اُستانی کی خدمات حاصل نہ کر سکا۔ انجمن کے سیکرٹری نے مجھ سے کچھ دن ہوئے کہا تھا کہ استانی کا حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ کچھ دن ہوئے میں نے ایک لکچر دیا تھا جس

کا عنوان یہ تھا: ''بہ حیثیت ایک ضروری جزو کے سوسائٹی کے ارتقاء میں مذہب کی حیثیت کیا ہے۔'' میں نے صرف تھوڑے سے نوٹ لکھے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ آیا کسی نے وہ باتیں قلمبند کیں یا نہیں جو میں نے کہی تھیں۔ انجمن کا لکچر انگریزی میں ہوگا۔ اس کا عنوان ہے ''اسلام کا اخلاقی اور سیاسی مطمع نظر۔'' اگر یہ چھپا تو میں اس کا ایک نسخہ آپ کو بھیج دوں گا۔ میں ''آبزرور'' کے ایڈیٹر سے کہہ دوں گا کہ وہ آپ کو ''آبزرور'' کی وہ کاپی بھیج دیں جس میں وہ لکچر چھپے۔

عبدالقادر چیف کورٹ میں پریکٹس کرنے کی غرض سے لاہور آ گئے ہیں۔

مجھے یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ آپ میری اس بات کا یقین نہیں کرتیں کہ میں آپ سے اور ڈیر ہائی نیسز سے جو میرے حال پر اس قدر مہربان ہیں۔ ملنے کے لئے بمبئی آ رہا تھا۔ میں یقینی طور پر آنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ یہ امر کہ آیا یہ ممکن ہو سکے گا یا نہیں، اس کے بارے میں میں فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا میرے لئے اس سے زیادہ سکون واطمینان کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

دو تین ہفتے ہوئے میرے پاس آپ کی دوست لڑکی دیکھے ناست کا خط آیا تھا۔ میں اس لڑکی کو بے حد پسند کرتا ہوں۔ وہ کس قدر اچھی اور سچی ہے! میں نے اُسے خط لکھا ہے اور اچھے بوڑھے فراپروفیسر کو بھی۔

مہربانی کرکے ڈیر ہائی نیسز کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیجئے اور انہیں میری دوستی کا یقین دلا دیجئے۔ جو اگرچہ ان کے لئے زیادہ کارآمد نہیں ہے تاہم وہ سچی اور استوار ہے۔ آپ کا صادق ——— اقبالؔ

اقبالؔ کا یہ خط ہمدردانہ توجہ کا محتاج تھا اور ضرورت تھی کہ اس کے بارے میں احتیاط برتی جائے اور اس لیے میں نے انہیں جو خط لکھا اس میں اُن کی مصیبت پر اظہار ہمدردی کیا گیا تھا۔ مزید برآں میں نے انہیں یہ کہہ کر مطمئن کیا تھا کہ وہ اس مایوسی اور قنوطیت کا جس کا ذکر انہوں نے اپنے خط میں کیا ہے، شکار ہو کر سخت کمزوری کا اظہار کر رہے ہیں۔ میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں ملاقات کے وقت انہیں بتاؤں گا کہ وہ چھوٹی چھوٹی مشکلات پر جو انسان کو ورثہ میں ملی ہیں قابو نہ پا سکنے میں کس قدر حماقت کا اظہار کر رہے ہیں اور یہ کہ صرف ان سے کم قابلیت کے اشخاص ہی ایسے طریقے اختیار کر سکتے ہیں جن کا اظہار انہوں نے اپنے خط میں کیا ہے۔ میں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ عبدالقادر (اب سر عبدالقادر) سے ملیں جو اس زمانہ میں لندن ہی میں تھے اور ہم سے ملاقات کرتے رہتے تھے اور یونیورسٹی میں ہمارے تعلیمی مشاغل کے بارے میں مختلف مسائل پر بحث بھی کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس طریقے سے اقبالؔ کی توجہ اپنے قنوطیت آمیز طرز عمل سے ہٹ جائے گی اور وہ بار بار اپنی "مصیبت" پر غور کرنے سے باز رہیں گے۔ میں نے انہیں ان کے موجودہ ماحول سے نکالنے کی غرض سے فراپروفیسر اور مس ویگے ناست کا حوالہ دیا جس سے اقبالؔ بہت محبت کرتے تھے اور جو فلسفے کی ماہر تھیں اور ان کی استاد بھی رہ چکی تھیں۔ میں نے اقبالؔ سے اس کی بھی درخواست کی تھی کہ وہ جنیوا میں ہمارے گرلز سکول کے لئے کسی استانی کی تلاش کریں۔ ان تمام باتوں سے مقصود یہ تھا کہ اقبالؔ کی توجہ اس

مسئلے سے ہٹ جائے جو ان کے لئے سوہانِ رُوح بنا ہوا تھا۔ میں اپنی کوشش میں ایک بڑی حد تک کامیاب ہوئی جیسا کہ اُن کے خط مورخہ ۱۷۔اپریل ۱۹۰۹ء سے معلوم ہوگا۔ وھوھذا۔

لاہور، ۱۷۔اپریل ۱۹۰۹ء

مائی ڈیئر مس عطیہ!

آپ کے تسلّی بخش الفاظ کا شکریہ! آپ کے خط سے مجھے بہت سکون ملا۔

آپ لکھتی ہیں کہ آپ مجھ سے بہت سے سوالات پوچھنا چاہتی ہیں تو پھر آپ پوچھتیں کیوں نہیں؟

اور آپ جانتی ہیں کہ میں آپ سے کوئی بات نہیں چھپایا کرتا اور میرا اعتقاد ہے کہ ایسا کرنا گناہ ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرے خطوط بالکل اطمینان دلانے والے نہیں ہوتے، لیکن اس کا سبب وہ وجوہ ہیں جن کا ذکر آپ نے گزشتہ خط میں کیا تھا۔ مجھے فراموشی کا الزام نہ دیں۔ میں کوئی چیز نہیں بھولتا، لیکن میں تشریح سننا پسند کروں گا۔ محض یہ دیکھنے کے لئے کہ آپ کیا تشریح کرتی ہیں۔ گزشتہ رات میں بہشت میں پہنچا اور دوزخ کے دروازوں میں سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے اس جگہ کو خوفناک طریقہ پر سرد پایا جب فرشتوں نے مجھے متعجب دیکھا تو انہوں نے کہا کہ یہ جگہ اپنی فطرت کے اعتبار سے سرد ہے لیکن وہ شدّت سے گرم ہو جاتی ہے اس لئے کہ ہر ایک شخص اپنے انگارے اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس ملک میں جہاں کوئلہ

کی کانیں بہت زیادہ نہیں ہیں، جتنے انگارے جمع کرنے ممکن ہیں میں ان کے جمع کرنے کی تیاری میں مصروف ہوں۔

عبدالقادر سے میری اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ تقریباً ہر روز چیف کورٹ کے بار روم (کمرۂ وکلاء) میں۔ لیکن عرصۂ دراز سے ہم نے آپ کے متعلق کوئی بات چیت نہیں کی۔ آج کل میں دوسروں سے زیادہ بات چیت نہیں کرتا۔ میری اپنی بدنصیب ذات مصیبت انگیز خیالات کی کھان بنی ہوئی ہے جو سانپ کی طرح میری رُوح کے عمیق اور تاریک سوراخوں سے باہر نکلتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں سپیرا بن جاؤں گا اور بازاروں میں پھرتا پھروں گا اس طرح سے کہ متجسس لڑکوں کی ایک جماعت میرے پیچھے ہو گی۔

یہ خیال نہ کیجئے گا کہ میں یاس پسند ہوں۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ تکلیف نہایت ہی لذیذ چیز ہے اور میں اپنی بدقسمتی سے لطف اندوز ہوتا ہوں اور ان لوگوں پر ہنستا ہوں جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ خوش و خرم ہیں۔ آپ دیکھتی ہیں کہ میں اپنی مسرت کس طرح چھپ چھپا کر حاصل کر لیتا ہوں۔

چند دن ہوئے مس ویگے ناسرت کا خط مجھے موصول ہوا تھا۔ جب میں انہیں خط لکھوں گا تو انہیں اُن دنوں کی یاد دلا دوں گا جب کہ آپ جرمنی میں تھیں ـــــ آہ! وہ دن جو پھر کبھی نہ آئیں گے۔ وہ آج کل اپنے ہی گھر پر ہیں یعنی ہائل برون میں، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اب ہائیڈلبرگ آ گئی ہوں گی۔ تاکہ فراپروفیسر کے تعلیمی کام میں ان کی اعانت کریں۔ آپ یقین رکھیں کہ وہ بالکل اچھی طرح سے ہیں۔ مہربانی کر کے میری بدخطی کو نظر انداز کر دیں۔ مجھے

یاد نہیں کہ میں اس سے پہلے کیا کچھ لکھ چکا ہوں۔ ہر آنے والا لمحہ اپنے خیالات اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس لئے اگر آپ یہ دیکھیں کہ میرا خط بے جوڑ اور غیر مربوط سا ہو گیا ہے تو آپ اس بیلانی کو معاف کر دیں۔

استانی کے متعلق یہ ہے کہ مجھے ایک درخواست موصول ہوئی ہے جسے انجمن حمایت اسلام، لاہور کے زنانہ مدارس کی سپرنٹنڈنٹ نے بھیجا ہے میں اس سے خط و کتابت کروں گا اور بہت جلد آپ کو نتیجہ سے مطلع کروں گا لیکن میں اتنا معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا انہیں کسی سرکاری مدرسے میں اور جنجیرہ میں یا بمبئی میں تعلیم دینی ہوگی۔ میرے بڑے بھائی کا تبادلہ ایسی جگہ ہو گیا ہے جو بمبئی سے تقریباً ۱۶ میل کے فاصلہ پر ہے۔ وہ وہاں عنقریب جانے والے ہیں۔

"آبزرور" کے دو پرچے اس خط کے ہمراہ بھیجے جا رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ انہیں دلچسپی سے پڑھیں گی۔ مہربانی کر کے ڈیر ہائی نیس سے میرا سلام کہہ دیں اور مجھے شکر گزار بنائیں۔

آپ کا بہت بہت صادق

اقبالؔ

میں اپنی مختلف سرگرمیوں بالخصوص مسلم لڑکیوں کی تعلیم کی وجہ سے باقاعدگی کے ساتھ ان سے خط و کتابت جاری نہ رکھ سکی اور اس لئے مجھے اپریل ۱۹۰۹ء اور جولائی ۱۹۰۹ء کے درمیان کسی خط کا سراغ نہیں ملتا۔ لیکن یہ بدیہی ہے کہ میں نے اس مدت میں اقبالؔ کو ضرور خط بھیجے ہوں گے

تاکہ میں انہیں اس یاس و قنوطیت کے ماحول سے باہر نکال سکوں جو اُن پر مسلّط ہو چکا تھا۔ اقبالؔ نے نہ صرف اپنی قنوطیت پر غلبہ حاصل کر لیا جو ایک زمانے تک اُن پر حاوی رہی بلکہ ان پر ظرافت کا رجحان پھر سے پیدا ہو گیا اور اسی رنگ میں وہ اپنے خط کی ابتدا کرتے ہیں۔ میں نے انہیں لکھا تھا کہ اگر کبھی ان کا جنجیرہ آنا ہوا تو انہیں اس جگہ تک پہنچنے کے لئے جہاز، کشتیاں، تانگہ استعمال کرنا پڑے گا اور کھاڑیوں وغیرہ کو عبور کرنا ہو گا۔ وہ میرے اس خط کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں اُن سے کہا گیا تھا کہ چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کی جانب متوجہ ہونے میں وہ غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں اور پھر وہ اپنے معمولی طریقہ سے لکھتے لکھتے فلسفیانہ باتوں کا ذکر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ اپنے بارے میں خود اپنے خالق سے جواب و سوال کریں گے۔ وہ اس خط میں چند اشعار بھی لکھ کر بھیجتے ہیں جو خالی از دلچسپی نہیں۔ میں نے بعض وجوہ سے ــــ مجھے یاد نہیں کیوں ــــ ان کو ڈانٹا تھا اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ زیادہ محتاط رہیں۔ اس کا ذکر وہ اپنے خط میں کرتے ہیں۔ اپنے خط کے آخر میں وہ ایک نظم کا حوالہ دیتے ہیں جو انہوں نے مجھے میونک سے بھیجی تھی اور مجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ میں انہیں اس کی نقل بھیج دوں۔

لاہور ۱۷۔ جولائی ۱۹۰۹ء

مائی ڈیر مس عطیہ!

آپ کی چٹھی مجھے ابھی ابھی ملی ہے۔ اس کا بہت بہت شکریہ قبول کیجئے۔ آج صبح میں اپنے آپ کو عجیب و غریب طریقہ پر بشاش پاتا ہوں۔

اس لئے براہ کرم آپ مجھے معاف کر دیں اگر میرے خط میں مزاح کا رنگ پائیں۔ میں نے اپنے منصوبے نہیں بدلے۔ آپ میری خاموشی سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب نہیں ہیں لیکن بلاشبہ مجھے بعض اوقات دو کشتیوں سے، ایک جہاز سے، دو تانگوں سے اور کھاڑیوں سے خوف معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور یہ حقیقی ہفت خواں ہیں جو مجھے رستم کی شہرت دے دیں گے اگر میں ان کو عبور کر لوں گا۔ رستم کا انعام بہت بڑا تھا اور مجھے یقینی طور پر معلوم نہیں کہ میرا انعام کیا ہوگا۔ میں عام طور سے کسی کام کے کرنے کے لئے پہلے ارادہ کرتا ہوں اور پھر اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیتا ہوں اور انہیں اجازت دیتا ہوں کہ وہ مجھے جہاں چاہیں لے جائیں۔ آپ آگاہ نہیں ہیں کہ آپ نے میرے ساتھ کیا بھلائی کی ہے —— یہ سچ بھی ہے اور اس لئے بہتر بھی ہے۔ آپ خود بھی اس سے آگاہ نہیں ہو سکتیں۔ میں اس سے آگاہ ہوں لیکن اسے بیان نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس موضوع کو جانے دیجئے۔ میرے لئے کسی ایسی چیز کو بیان کرنا بیکار سا ہوگا جو ناقابل بیان ہے، اور پھر آپ کہتی ہیں کہ آپ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی شکایات (آپ انہیں چھوٹی کہہ کر غلط بیانی سے کام لے رہی ہیں) کیا میں انہیں معلوم کر سکتا ہوں؟ آپ اس کے متعلق اطلاع بہم پہنچانے سے دریغ نہ کریں گی بالخصوص اگر یہ شکایات میرے خلاف ہیں —— بلاشبہ ہر ایک شخص آرام کی جگہ کا صبر کے ساتھ انتظار کر رہا ہے۔ میں خود اس جگہ جانے کے لئے بیتاب ہوں اس لئے کہ میں اپنے خالق سے ملنا چاہتا ہوں اور اُس سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ

مجھے میری قلبی کیفیت کی معقول تشریح بتائے ۔ اور میرا خیال ہے کہ اُس کے لئے ایسا کرنا آسان نہ ہوگا ۔ میں خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکا ۔ آپ کو اس کی شکایت نہ کرنی چاہیئے ۔ کئی سال ہوئے میں نے یہ شعر کہا تھا ؎

اقبالؔ بھی اقبالؔ سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

بہت سے اشخاص نے میرے متعلق اسی قسم کے بیانات دیئے ہیں اور میں بسا اوقات تنہائی میں اپنے اُوپر ہنستا ہوں ۔ اب میرا ارادہ ہے کہ میں ایسے بیانات کا آخری مرتبہ جواب دے دوں اور شائع ہونے پر آپ اسے "مخزن" میں دیکھیں گی ۔ لوگ جو کچھ میرے متعلق خیال کرتے ہیں اُسے میں نے خوبصورتی سے بیان کر دیا ہے ۔ ابھی جواب کی تصدیق ہونی باقی ہے ۔

مجھے یہ سُن کر افسوس ہوا کہ آپ کو اس بات سے تکلیف ہوئی کہ شمالی ہندوستان کے لوگ میرا احترام نہیں کرتے اور میری تعریف نہیں کرتے ۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ مجھے دوسرے لوگوں کے احترام کی کچھ پروا نہیں ہے ۔ میں دوسروں کے سانس کی مدد سے زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا ؎

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

میں سیدھی سادی دیانتدارانہ زندگی بسر کرتا ہوں ۔ میرا دل اور میری زبان ایک دوسرے کے ساتھ کلیتاً ہمنوا ہیں ۔ لوگ ریاکاری کا احترام کرتے ہیں اور اُس کی تعریف بھی ۔ اگر ریاکاری سے مجھے شہرت، احترام اور تعریف

حاصل ہوتی ہے تو میں اسے پسند کروں گا کہ میں ایسی حالت میں مر جاؤں جب کہ مجھے جاننے والا اور میرا ماتم کرنے والا کوئی بھی نہ ہو۔ پبلک کے بہت سے پیروں والے عفریت کو اپنے احترام کا فضلہ دوسروں کو دینے دیجئے جو مذہب اور اخلاق کے بارے میں جھوٹے مطامع نظر کی مطابقت میں عمل کرتے ہوئے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں ان کے رسوم و رواج کا احترام کرنے کی غرض سے جو انسانی دماغ کی فطری آزادی کو دباتے ہیں، اپنے آپ کو جھکا نہیں سکتا۔ بائرن، گوئٹے اور شیلے کا ان کے زمانہ کے لوگوں نے مطلق احترام نہیں کیا اور اگرچہ میں شاعرانہ اعتبار سے ان سے کہیں کم ہوں تاہم میں فخریہ کہہ سکتا ہوں کہ اس بارے میں مجھے ان سب کی رفاقت حاصل ہے۔

کیا میں نے آپ کو کچھ لکھایا پڑھایا ہے؟ آپ کو سیکھنے سکھانے کی کبھی ضرورت ہی نہ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے افلاطون سے آپ کا تعارف کرایا تھا لیکن یہ معاملہ وہیں ختم ہو گیا۔ ہم نے فلسفۂ افلاطون اس قدر کم پڑھا ہے کہ میں منصفانہ طور پر اس عزت کے حصول کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے آپ کو کچھ سکھایا۔ آپ کہتی ہیں کہ میرے دل میں آپ کی خواہشات کا احترام نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ چیز عجیب و غریب ہے اس لئے کہ ہمیشہ سے میری یہ عادت رہی ہے کہ میں آپ کی خواہشات کا مطالعہ کروں اور آپ کو ہر ممکن طریقہ سے خوش کروں۔ مگر بعض اوقات ایسی چیز میرے اختیار سے باہر ہو جاتی ہے اور فطری قوت مجھے مختلف سمت میں جانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ "ورنہ آپ کو زیادہ محتاط بننا ہوگا" ـــــ میں اقرار کرتا ہوں کہ

میں آپ کے مفہوم کو بالکل سمجھ نہیں سکا۔ براہ مہربانی تشریح کر کے بتائیے کہ کس بارے میں مجھے زیادہ محتاط رہنا چاہیئے۔ میں ہر وہ کام کرنے کے لئے تیار ہوں جس سے آپ خوش ہوں۔ دنیا میری پرستش نہیں کر سکتی نہ میں یہ خواہش رکھتا ہوں کہ میری پرستش کی جائے۔ اس لئے کہ میری فطرت ہی ایسی ہے کہ میں پرستش کا موضوع نہیں بن سکتا۔ میرے رگ و ریشے میں تو پرستش کرنے والے کا فطری رجحان اس قدر گہرے طریقے سے پیوست ہو چکا ہے لیکن اگر میری روح کے عمیق ترین خیالات کبھی پبلک پر ظاہر ہو جائیں، اگر وہ باتیں جو میرے دل میں پوشیدہ ہیں کبھی سامنے آ جائیں تو مجھے یقین ہے کہ دنیا میرے انتقال کے بعد ایک نہ ایک دن بالضرور میری پرستش کرے گی۔ وہ میری کوتاہیوں کو بھلا دے گی اور آنسوؤں کی شکل میں خراج تحسین ادا کرے گی۔!

لفٹننٹ گورنر اس بات پر آمادہ تھا کہ گورنمنٹ کالج لاہور کی پروفیسری کے لئے جو خالی پڑی ہوئی ہے، میری سفارش کر دے لیکن میں نے اپنے ذاتی رجحان کے خلاف اس جگہ کے لیے امیدوار بننے کے خیال کو ترک کر دیا ہے۔ حالات مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں مختلف امور پر مالی نقطۂ نظر سے غور کروں۔ اور یہ نقطۂ نظر وہ ہے جس سے چند سال قبل مجھے دلی کراہیت تھی۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ خدائی امداد پر بھروسا کرتے ہوئے اپنے قانونی پیشے کو جاری رکھوں۔

کیا آپ مجھے اس نظم کی نقل بھیج دیں گی جو میں نے میونک سے آپ

کو بھیجی تھی ؛ میرے پاس اس کی کوئی نقل نہیں ہے اور میں ایک نقل اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔

براہِ کرم ویڑ ہائی نیسز کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیجیے !

آپ کا صادق :

محمد اقبال

اس وقفے میں کوئی اہم واقعہ رونما نہیں ہوا سوائے اس کے کہ اقبال نے مجھے لکھا تھا کہ وہ حیدرآباد جانا چاہتے ہیں اور مجھ سے تعارفی خط طلب کیا تھا۔ میں نے ایک خط انہیں بھیج دیا تھا جس میں میں نے اپنے پھوپی زاد بھائی اور بہن مسٹر اور مسز حیدری سے اُن کا تعارف کرایا تھا (مسٹر اکبر حیدری[1] اس زمانہ میں وزیر مالیات تھے) مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اقبال حیدرآباد کے گرویدہ ہوگئے ہیں اور وہ اس نظر فریب بھڑک سے متاثر نظر آتے ہیں جو ہندوستانی ریاستیں باہر والوں کو دکھانے کی عادی ہیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اقبال وہاں جاکر اپنی توجہات کو معمولی کاموں کے لئے وقف کر دیں گے بجائے اس کے وہ انہیں اعلیٰ مقاصد کے لئے استعمال کریں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مالی مشکلات میں مبتلا ہیں اور ممکن ہے کہ جس آدمی کی راہ میں اس قسم کی مشکلات حائل ہوں وہ ہر اس تنکے کا سہارا لے لیتا ہے جو اس کی راہ میں

---

[1] سر اکبر اس وقت بحیثیت معتمد عدالت و امور عامہ تھے اس سے کچھ دن پہلے وہ بحیثیت معتمد فنانس کارگزار تھے۔

آتا ہے۔ اس لئے میں نے انہیں سخت الفاظ میں سرزنش کی تھی۔ جو خیال اس کی تہ میں کارفرما تھا یہ تھا کہ وہ کسی ریاستی ترغیب و تحریص کے پھندے میں نہ پھنس جائیں۔

لاہور ۳۰۔ مارچ ۱۹۱۰ء

مائی ڈیئر مس عطیہ!

آپ کے "ملامت نامہ" کا بہت بہت شکریہ۔ جس سے میں بے حد لطف اندوز ہوا۔ "ملامت" سے زیادہ دوست کی اور کوئی چیز لطف اٹھانے کے قابل نہیں ہوتی۔ مجھے ہز ہائی نیس کا دعوت نامہ حیدر آباد میں ملا تھا اور اس کے بعد ہی میں نے آپ کو خط لکھا تھا کہ میرے لئے مورووڈ (جنجیرہ) آنا کیوں ممکن نہیں ہے۔ کل میری واپسی پر مجھے آپ کا میٹھی جھڑکیوں والا خط ملا اور میں نے ہز ہائی نیس کو تار دے دیا کہ میں اپنے کالج کی مصروفیات کی وجہ سے نہیں آسکتا جو اتنی مرتبہ میرے لئے سنگ راہ بن چکی ہیں۔ اگر میں حیدر آباد میں کچھ دن اور ٹھہرتا تو مجھے یقین ہے کہ ہز ہائی نیس نظام مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار فرماتے۔ میں وہاں کے سب بڑے آدمیوں سے ملا اور ان میں سے بہت سوں نے مجھے اپنے یہاں مدعو بھی کیا تھا۔ میرا حیدر آباد جانا کچھ معنی رکھتا تھا جسے میں بوقت ملاقات بیان کروں گا۔ مسٹر و مسز حیدری سے ملنا میری سیاحت کا واحد مقصد نہ تھا۔ شاید آپ جانتی ہیں کہ حیدر آباد میں ان سے ملاقات کرنے سے قبل مجھے ان سے واقفیت کی مسرت بھی حاصل نہ تھی۔ میں ان کے یہاں کے قیام سے بہت لطف اندوز ہوا۔ یہ مسز حیدری

کی انتہائی مہربانی ہے کہ وہ میرا ذکر اس محبت سے کرتی ہیں۔ مجھے ان کے یہاں گھر کا سا آرام ملا۔ میں ان کی عربی سپرٹ کو بے حد پسند کرتا ہوں اور ان تمام کاموں میں جو اُن کی توجہ یا ہمدردی حاصل کر لیتے ہیں، میں ان کی سمجھداری اور دانشمندی کا مداح ہوں۔ زیادہ تر مسٹر اور مسز حیدری کے اثرات کا نتیجہ تھا کہ مجھے حیدر آباد کی سوسائٹی کے بعض بہترین نمونے دیکھنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ مسٹر حیدری اعلیٰ کلچر اور وسیع ہمدردیاں رکھنے والے شخص ہیں میں انہیں خشک حقائق اور مالی اعداد و شمار کا آدمی سمجھے بیٹھا تھا لیکن قدرت نے انہیں ایک نہایت نفیس تخیل اور بہت ہی نازک دل عطا کیا ہے۔ میرے دل میں ان دونوں کا بے حد احترام ہے۔ ان کا گھر دوسری حقیقی جگہ ہے جہاں مجھے گھر کا سا آرام ملا۔ پہلی جگہ آرنلڈ کا گھر تھا۔ مسز حیدری اپنے میں وجدانی کیفیت رکھتی ہیں جس کی وجہ سے وہ اس سے زیادہ واضع طریقہ سے چیزیں دیکھ سکتی ہیں جتنا مرد اپنے ٹھنڈے تجزیہ کرنے والے استدلال کے ذریعہ دیکھنے کے عادی ہیں۔

اب آپ کیا اتنی مہربانی نہ کریں گی کہ ویرہائی نیسز سے میری جانب سے معذرت پیش کر دیں اور معافی مانگیں؟ مجھے معلوم نہیں کہ میرے اس خط کا کیا حشر ہوا جو میں نے آپ کو ہز ہائی نیس کا تار ملنے پر بھیجا تھا۔ میں بدقسمتی سے ایسا شخص ہوں جو اپنی دلی محبتوں کو ظاہر نہیں کیا کرتا لیکن اس کے باوجود وہ عدم اظہار کے باعث بہت عمیق رہتی ہیں۔ اس وجہ سے لوگ خیال کرنے لگتے ہیں کہ میں بے حس ہوں۔ براہ کرم ویرہائی نیسز کو یقین دلا دیجئے کہ میں ہمیشہ

اُن کے کہنے میں ہوں اور جب کبھی میرے لئے جنجیرہ آنا ممکن ہوگا میں نہایت مسرت کے ساتھ ایسا کروں گا۔ میری اتفاقی چھٹی صرف دس دن کی تھی اور وہ ۲۸ تاریخ کو ختم ہوگئی۔ میں حیدرآباد سے ۲۳ کو روانہ ہوا اور حیدرآباد سے لاہور تک جانے میں تقریباً چار دن لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے واپسی پر اورنگ زیب کے مقبرے کی زیارت بھی کرنی تھی جس پر میں ایک نہایت ولولہ انگیز نظم لکھنے والا ہوں جو اُردو پڑھنے والوں کے لئے نہایت درجہ رُوح پرور ہوگی۔ میں ۲۹ دیں کی صبح کو لاہور پہنچا اور سیدھا کالج چلا گیا اور وہاں سے کچہری۔ ان حالات میں آپ خود ملاحظہ کر سکتی ہیں کہ میرے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ میں جنجیرہ کا سفر اختیار کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ اس تشریح سے آپ کو یقین آ جائے گا اور آپ میری وکالت کریں گی۔ مجھ میں خامیاں ضرور ہیں لیکن ریاکاری اور بے اعتنائی مجھ میں نہیں ہے۔ شاید آپ یہ کہنا چاہیں کہ میں (خود اپنے لئے بھی) ایک راز ہوں لیکن یہ "راز" ایسا ہے جس کا علم سب کو ہے۔ ع

وہ راز ہوں کہ زمانہ پہ آشکار ہوں میں

ممکن ہے میرے اطوار عجیب معلوم ہوتے ہوں لیکن اس خراب دنیا میں جہاں کے طور اطوار میرے طور اطوار سے زیادہ عجیب واقع ہوئے ہیں موقع ہی وہ واحد معیار ہے جس سے کسی شخص کی حقیقی فطرت کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی موقع آیا تو میں یقیناً آپ کو بتاؤں گا کہ میں اپنے دوستوں سے کس قدر شدید محبت کرتا ہوں اور میرا دل ان سب کے لئے کس گہرے طریقے سے بیتاب رہتا ہے۔ لوگ زندگی کو پیارا سمجھتے ہیں اور صحیح بھی یہی ہے مجھ میں

طاقت ہے کہ میں اسے مُفت دے دوں جب کبھی دوسروں کو اس کی ضرورت ہو۔ نہیں ـــــ! مجھے بے پروا یا ریاکار نہ کہئے ـــــ کنایتاً بھی نہیں۔ اس لئے کہ اس سے میری رُوح کو تکلیف پہنچتی ہے اور میں اس خیال سے کانپ اٹھتا ہوں کہ آپ میری فطرت سے ناواقف ہیں۔ کاش! میں اپنے دل کو اندر سے دکھا سکتا تاکہ آپ بہتر طریقہ سے میری رُوح کا مشاہدہ کر سکتیں جس کے متعلق آپ کا خیال ہے کہ ریاکاری اور بے پروائی کی وجہ سے اس پر تاریکی چھا گئی ہے

برائے کرم میری جانب سے اس ناگزیر کوتاہی کی معافی مانگ لیجئے اور مجھے فوراً اطلاع دیجئے کہ میری تشریح نے ان کو مطمئن کر دیا ہے۔

آپ کا ہمیشہ کا صادق

محمد اقبال

اس کے بعد میں نے ایک اور سخت خط لکھا ہوگا جس میں اُنہیں بتایا ہوگا کہ اگر اُنہوں نے کسی ہندوستانی ریاست کی ملازمت قبول کر لی تو وہ اپنی خداداد غیر معمولی قابلیت کو کھو بیٹھیں گے۔ ان کا ۷۔ اپریل ۱۹۱۰ء کا خط خود آپ اپنی تشریح ہے:

لاہور، ۷۔ اپریل ۱۹۱۰ء

مائی ڈیئر مس عطیہ

آپ کے نوازش نامے کا بہت بہت شکریہ جو مجھے آج صبح ملا۔ آپ بظاہر اس بات کا احساس نہیں کرتیں کہ میں نے حیدرآباد سے دو خط بھیجے تھے۔ ایک تو اس سے پہلے کہ مجھے آپ کے پاس سے کوئی اطلاع ملے

اور دوسرا اس کے بعد کہ مجھے آپ کا تار ملے۔ دوسرے خط میں میں نے آپ کے تار کی رسید دی تھی اور آپ کو بتایا تھا کہ میرے لئے جھنجیرہ آنا کیوں ممکن نہیں ہے لیکن بدقسمتی سے یہ دوسرا خط، جس کی وجہ سے آپ کی سرزنش میں بہت کچھ کمی آجاتی، غلطی سے کہیں اور چلا گیا۔ میں حیران ہوں کہ وہ آپ تک کیوں نہیں پہنچا۔ مجھے ڈر ہے کہ آپ میرے طریقۂ کار اور منشاء کے بارے میں بہت ہی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی ہیں اور آپ سے ملاقات کئے بغیر آپ کی غلطی کی اصلاح کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس دوستی کے مفاد کی خاطر جس کا مجھے اب تک دعویٰ ہے، یہ امر بالکل ضروری ہو گیا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے ملاقات کریں اور میں ایسا کرنے کی غرض سے وقت نکال لوں گا اگرچہ آپ کا خیال ہے کہ زبانی تشریح کا کوئی موقع نہیں آئے گا۔ مجھے امید ہے کہ میں آپ کو اپنی صداقت اور اخلاص کا یقین دلا سکوں گا۔ مجھے آپ کی اچھی فطرت پر اعتماد ہے لیکن فی الحال میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ میری تشریح کو ویڈرما ٹینیسز کی خدمت میں پہنچا دیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کے مقابلے میں کہیں زیادہ درگزر نے والے ہیں۔ جو غلط فہمی بدقسمتی سے ہم دونوں میں پیدا ہو گئی ہے وہ بہت سے اسباب کی رہین منت ہے اور مجھے ڈر ہے کہ یہ اسباب غیر شعوری طریقے سے آپ کے دماغ میں عمل کر رہے ہیں۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ انہوں نے آپ کو اس حد تک میرے خلاف بدظن کر دیا ہے کہ آپ مجھ پر عدم اخلاص اور عدم صداقت کا الزام دھر رہی ہیں۔ مہربانی کر کے میرے حیدرآباد جانے کے بارے میں کوئی نتائج اخذ نہ کیجئے، مثلاً

یہ کہ نظام کی جانب سے قدر شناسی وغیرہ، تاوقتیکہ آپ میرا بیان نہ سُن لیں۔ میں اتنا لمبا سفر محض دوستوں سے ملنے کی خاطر اختیار نہیں کر سکتا تھا ایسے وقت میں جب کہ مجھ میں ایسا کرنے کی مقدرت نہ تھی۔ میں آپ سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ حیدرآباد کی سوسائٹی کے بارے میں جو کچھ آپ کہتی ہیں اس سے میں متفق ہوں۔ آج صبح تک جب مجھے آپ کا آخری خط ملا میرا یہ خیال تھا کہ آپ کا جو خط مجھے لاہور پہنچ کر ملا اس کی تہ میں آپ کی غیر خواہی کا جذبہ کارفرما ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ مجھ سے درحقیقت ناراض ہیں آپ کے خط نے مجھے پریشان کر دیا ہے اور مجھے یہ تمام باتیں اس وقت تک برداشت کرنی ہوں گی جب تک کہ میں آپ سے اپنی صفائی نہ کر لوں۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرے دل و دماغ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ میں ابھی تک وہی شخص ہوں۔ ایک نہ ایک دن آپ خود دیکھ لیں گی۔ یہ میری پیشین گوئی ہے۔

میں نے یہ کب کہا تھا کہ نظام کی قدر شناسی میری عزت افزائی کا باعث ہے؟ آپ جانتی ہیں کہ میں ان تمام باتوں کی مطلق پروا نہیں کیا کرتا۔ میں نہیں چاہتا کہ میں بحیثیت شاعر کے جانا پہچانا جاؤں۔ اگرچہ بدقسمتی سے لوگ اسی حیثیت سے مجھے جانتے ہیں۔ ابھی کچھ دنوں کی بات ہے کہ نیپلز سے ایک اطالوی بیرونیس کا خط میرے پاس آیا تھا۔ جس میں مجھ سے میری چند نظمیں مع انگریزی ترجمہ کے طلب کی گئی تھیں۔ لیکن شاعری کے متعلق میں اپنے دل میں کسی قسم کا ولولہ محسوس نہیں کرتا اور آپ ہی اس کی

ذمہ دار ہیں۔ میں ایک ہندوستانی والیٔ سلطنت کی قدر شناسی کی کیا پروا کر سکتا ہوں جب کہ غیر ممالک کے صاحب کلچر اشخاص کی قدر شناسیاں مجھے ملتی رہتی ہیں؟ نہیں، مائی ڈیر مس عطیہ ــــ! آپ میرے بارے میں کسی غلط فہمی میں نہ پڑیں اور ایسا خطا لمانہ طرزِ عمل اختیار نہ کریں جیسا آپ نے میری توقعات کے خلاف اپنے آخری خط میں اختیار کیا ہے۔ آپ نے ساری باتیں ابھی تک نہیں سنیں۔ آپ میری تکالیف سے واقف نہیں جو ایک بڑی حد تک میرے طریقۂ عمل کی تشریح کر دیں گی۔ آپ کے متعلق میرے طرزِ عمل کی مکمل تشریح کے لئے ایک غیر ضروری طور پر طویل خط درکار ہوگا ــــ شاید ایک سے کہیں زیادہ خطوط۔ مزید برآں الفاظ کی حقیقی آواز کاغذ پر ان آوازوں کی نقل سے بہت زیادہ یقین دلانے والی ہوتی ہے۔ کاغذ میں ہمدردی کا احساس نہیں ہوتا اور ایسی بھی باتیں ہوتی ہیں جن کا اظہار کاغذ پر نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے میرے منشا کا اندازہ کرنے میں اس قدر عجلت سے کام نہ لیں۔ آپ مجھے الزام دیتی ہیں کہ میں بھاڑے کا ٹٹو اور عملی آدمی بن گیا ہوں۔ شاید اس میں صداقت کا عنصر موجود ہو، لیکن جب آپ تمام حالات سے باخبر ہو جائیں گی اس وقت اس کے لئے کچھ نہ کچھ وجہ جواز ضرور پائیں گی۔ دوسرے امور میں میں ابھی تک خواب دیکھنے والا شخص ہوں اور "خوبصورت خیالات کا خواب دیکھنے والا" جیسا کہ آپ کے ایک دوست نے حال ہی میں اردو لٹریچر پر اپنے ایک مضمون میں میرے متعلق تحریر کیا ہے۔ ہز ہائی نیس نے میری نقل و حرکت کے بارے میں آپ کو واحد حکم سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ کیا میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے

ایسا بنا رہنا پسند نہیں کیا، اگرچہ میں نے اس حکم کی طاقت کو تسلیم کر لیا ہے
اور ہمیشہ تسلیم کروں گا؛ بعض اشخاص آپ کے بارے میں مجھے بھی ایسا ہی
حکم تسلیم کرتے ہیں لیکن میری مایوسی کا اندازہ کیجیے جب میں نے دوسرے آدمیوں
سے یہ سُنا کہ آپ نے لاہور آنے کا ارادہ کر لیا تھا، اور آپ سفر کے انتظامات
میں مصروف تھیں؛ اور آپ نے اتنا بھی نہ کیا کہ مجھے اس کے بارے میں
ایک سطری اطلاع ہی دے دیتیں۔ یہ محض اتفاق تھا کہ مجھے آپ سے ملاقات
کرنے کی مسرّت نصیب ہو گئی تاکہ میری حالت اور زیادہ مصیبت زدہ
بن جائے۔ مجھے ڈر ہے کہ میں وہ باتیں لکھ رہا ہوں جو صرف گفتگو کے لیے
محفوظ رہنی چاہیئے تھیں۔ میں اس کے متعلق اور کچھ نہیں لکھوں گا اس لئے کہ
مجھے ترغیب ملتی ہے کہ میں اپنے دل کی ساری باتیں کہہ ڈالوں اور بہت
سی دوسری باتیں بھی کہوں — یہ ضروری نہیں کہ وہ اسی نوعیت کی ہوں جنہیں
میں کاغذ پہ لانا نہیں چاہتا۔ ان دنوں کی خاطر جب آپ مجھ پر اس قدر اعتماد
کرتی تھیں اور میرا لحاظ کرتی تھیں، آپ میری ایک بات مانیں — اور وہ یہ
ہے کہ آپ میری خاطر سے ویٹر ہائی نیسز کی خدمت یہ عرض کر دیں کہ وہ
میری صورتِ حالات کا اندازہ فرمائیں اور میری کوتاہی کو معاف کر دیں۔ اگر
میں آ سکتا تو یقیناً میرے لئے اس سے زیادہ مسرّت بخش اور کوئی بات نہ ہوتی
میں اور کچھ کہنا نہیں چاہتا مبادا میرے خط کے لہجہ کو ریاکارانہ سمجھا جائے
یہ میری بدقسمتی ہے کہ آپ میرے خطوط کو ایسی غلط فہمی کے پس منظر کے ساتھ
پڑھتی ہیں جو آپ کے دل میں میرے طرزِ عمل کے متعلق پیدا ہو چکا ہے اور

—اس بات کی کوشش نہیں کرتیں کہ اس خیال یا احساس کی ندی سے بچیں جس میں آپ کے خیالات نے بہنا شروع کر دیا ہے۔ آپ اگر ایسا نہیں کر سکتیں تو پھر سچائی اور دیانتداری کی خاطر جو جیسا کہ آپ خیال کرتی ہیں، اب مجھ میں باقی نہیں ہیں اور جو جیسا کہ مجھے یقین ہے، بے شک آپ ہی کے حصّہ میں آئی ہیں، آپ اس وقت تک انتظار کریں جب تک کہ ساری حقیقت آپ کے سامنے نہ آ جائے۔ ایسا کرنا محض منصفانہ ہوگا اور آپ یقیناً منصف ہیں اگرچہ آپ بعض اوقات ظالم اور بے درد نظر آتی ہیں۔ ان دنوں کی یاد میں — دن جو فطرت میں مُردہ ہو چکے ہیں لیکن میرے دل کی دنیا میں زندہ ہیں — میرا پیغام اُن تک ضرور پہنچا دیں اور اُن سے کہہ دیں کہ وہ میری کوتاہی کو بے اعتنائی پر محمول نہ فرمادیں یا اس امر سے نسبت نہ دیں کہ کوئی اور ہستی میرے دل میں زیادہ محبوب جگہ کی مالک ہے یا میرے اندازہ میں زیادہ بلند مقام پر فائز ہے۔ واپس لاہور آنے پر مجھے آپ کا خط ملا اور میں نے ہمزہائی نیس کو تار دے دیا کہ میں کالج کی مصروفیات کی وجہ سے جنجیرہ نہیں آ سکا لیکن مجھے معلوم نہیں کہ آیا میرا تار انہیں ملا ہے یا وہ بھی کسی غلط جگہ چلا گیا ہے اُس خط کی طرح جو میں نے حیدر آباد سے بھیجا تھا اور جس نے یہ افسوس ناک غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔

بہت بہت شکریہ نظم کی نقل کا جو آپ نے ازراہ مہربانی مجھے بھیجی ہے۔ مجھے اس کی سخت ضرورت تھی۔ میں نے ان اشعار کو یاد کرنے کی کوشش کی مگر بار بار کی کوششوں کے باوجود میں ایسا نہ کر سکا۔ ملک کے مختلف

حصّوں سے میرے پاس چھٹیاں آ رہی ہیں کہ میں اپنی نظموں کو کتابی صورت میں شائع کروں۔ ایک جنٹلمین نے جن سے شاید آپ مل بھی چکی ہیں، میرے لئے یہ سارا کام کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے ـــــ یعنی تمہید لکھنا، انہیں ہندوستان کے بہترین چھاپہ خانہ میں چھپوانا اور کتاب کی جلد بندی جرمنی میں کرانا۔ لیکن میرے دل میں اب شاعری کا کوئی ولولہ باقی نہیں رہا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے میری شاعری کی خوبصورت دیوی کو قتل کر دیا ہے اور مجھ سے میرا سارا تخیّل چھین کر مجھے رنڈوا بنا دیا ہے۔ شاید اورنگ زیب والی نظم ـــــ جن کے مزار کی زیارت میں نے حال میں کی ہے ـــــ میری آخری نظم ہو! میں ایسا محسوس کرتا ہوں گویا کہ اس نظم کا لکھنا میرے فرائض میں داخل ہے اور مجھے امید ہے کہ اگر وہ مکمل ہو گئی تو کچھ عرصہ تک ضرور زندہ رہے گی۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اب اپنا خط ختم کر دینا چاہیئے۔ میں نے آپ کو کافی زحمت دی ہے۔ اب رات کے ساڑھے بارہ بجے ہیں اور میں دن بھر کام کرنے کے بعد اپنے آپ کو نہایت تھکا ہوا پاتا ہوں اور اداس دل کے ساتھ بستر پر آرام کرنے جا رہا ہوں۔

آپ کی ساری جھڑکیوں کا بہت بہت شکریہ!

لاہور — آپ کا ہمیشہ کا صادق

۷ ویں اپریل ۱۹۱۰ء — محمد اقبالؔ

اپریل ۱۹۱۰ء اور جولائی ۱۹۱۱ء کے دوران میں بہت سی ایسی باتیں وقوع میں آئیں جنہوں نے اقبالؔ کی زندگی کو اجیرن بنا دیا تھا اور کوئی چیز

ایسی نہ تھی جو انہیں اس مصیبت سے بچا سکتی جس کی وجہ سے وہ زندگی کو تلخ زاویۂ نگاہ سے دیکھنے لگ گئے تھے۔ یہ تو صرف خدا ہی کو معلوم ہے کہ آیا یہ افتادِ طبیعت اس غرض سے تھی کہ ان کے تخیل کی دنیا یکسر بدل جائے، لیکن اتنا یقینی ہے کہ واقعات نے کچھ ایسی شکل اختیار کر لی تھی کہ اقبالؔ کی تمام تر توجہ اس سے زیادہ گہرے اور زیادہ پیچیدہ مسائل پر لکھنے کی جانب مبذول ہو گئی جن پر وہ اب تک لکھنے کے عادی تھے۔ اُن کے والد کی اس درخواست نے کہ وہ شاہ بو علی قلندرؒ کی طرح فارسی میں مثنوی لکھیں، اُن کے تخیل کی وسعت میں اضافہ کر دیا تھا اور بڑے زور شور سے فلسفیانہ لٹریچر کی جانب ان کی توجہ کے رُخ کو پھیر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزل خوانی کا دور جاتا رہا اور وہ شدید قنوطیت پسند بن گئے اور اس حالت میں وہ اپنے خالق سے سوالات کرتے تھے تاکہ وہ ان کے شبہات کا ازالہ کرے۔ جو جواب اُنہیں ملا وہ اُن کی زندگی کے کارناموں سے آشکار ہے اس لئے کہ سوالات کا سلسلہ ضروری تشفی حاصل کئے بغیر جاری رہا۔ بہت سے امور میں انہوں نے نیٹشے اور شاپنہور جیسے مغربی فلسفیوں کی تعلیمات میں پناہ لی اور شیلے اور بائرن جیسے شعراء گوشۂ گمنامی میں ہٹتے چلے گئے اور اقبالؔ کا طرزِ عمل سرکشانہ رہا اور وہ نہایت جرأت کے ساتھ (مگر بے اصولی کے ساتھ نہیں) حملے کرتے ہی رہے۔

لاہور

۷۔ جولائی ۱۹۱۱ء

مائی ڈیر مس فیضی!

مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں آپ کے نوازش نامہ کی طرف جو

مجھے کچھ عرصہ ہوا ملا تھا، اب تک توجہ نہ دے سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ان دنوں بہت ہی پریشان رہا ہوں۔ میری بدقسمتی ایک وفادار کتّے کی طرح میرا پیچھا کر رہی ہے اور میں نے اس خاتون کو پسند کرنا سیکھ لیا ہے بسبب اس کی نہ تھکنے والی وفاداری کے جو اُسے اپنے بدنصیب اور ناشاد بادشاہ سے تھی۔ تفصیل میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔

نظموں کے بارے میں یہ ہے کہ میں بہت مسرّت کے ساتھ آپ کو ان کی ایک نقل ارسال کردوں گا۔ میرے ایک دوست نے مجھے میری نظموں کا ایک مجموعہ بھیجا ہے اور میں نے ایک شخص کو اس کی نقل کرنے کے لئے مقرر کر لیا ہے۔ جب یہ کام ختم ہو جائے گا تو میں سارے مجموعے کی نظر ثانی کروں گا اور ان نظموں کو دوبارہ لکھوں گا جو اشاعت کے قابل ہوں گی اور اُن کی ایک نقل آپ کو بھیج دوں گا۔ میرا شکریہ ادا کرنے کی آپ کو ضرورت نہیں اس لئے کہ آپ کو خوش رکھنا جیسا کہ آپ نے اپنے نوازش نامہ میں تحریر کیا ہے، میرا کافی معاوضہ ہے۔ برخلاف اس کے میں آپ کا شکر گزار ہوں بوجہ اس تعریف و توصیف کے جس کا میں مطلق حق دار نہیں ہوں۔ لیکن آپ یہ نظمیں لے کر کیا کریں گی؟ یہ تو ایک زخمی دل کی درد بھری چیخیں ہیں۔ ان میں مسرّت کی کوئی بھی بات نہیں ہے جیسا کہ میں نے انتساب میں لکھا ہے ؎

خندہ ہے بہر طلسم غنچہ تمہید شکست
تو تبسم سے مری کلیوں کو نامحرم سمجھ

درد کے پانی سے ہے سرسبزیٔ کشتِ سخن

فطرتِ شاعر کے آئینہ میں جوہر غم سمجھ

میری سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ میں اشاعت کے لئے کون سی نظموں کا انتخاب کروں۔ گزشتہ پانچ چھ سال کے دوران میں میری نظمیں زیادہ تر پرائیویٹ نوعیت کی رہی ہیں اور میرا خیال ہے کہ پبلک کو ان کے پڑھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ان میں سے بعض کو تو میں نے کلیتہً تلف کر دیا ہے اس ڈر سے کہ کہیں کوئی انہیں چرا کر نہ لے جائے اور شائع نہ کر دے۔ بہرحال میں دیکھوں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ والد نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں بوعلی قلندرؒ کی مثنوی کے نمونہ پر فارسی میں کوئی مثنوی لکھوں اور اس اہم کام کی مشکلات کے باوجود میں نے ایسا کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نالہ را اندازِ نو ایجاد کن — بزم را از ہاؤ ہو آباد کن

آتش استی بزم عالم بر فروز — دیگراں را ہم ازیں آتش بسوز

سینہ را سر منزلِ صد نالہ ساز — اشک خونیں را جگر پرکالہ ساز

پشتِ پا بر شورشِ دنیا بزن

موجۂ بیرون ایں دریا بزن

باقی اشعار میں بھول گیا ہوں لیکن امید ہے کہ جب میں کچہری سے لوٹوں گا انہیں یاد کر سکوں گا۔ اب دس بجے ہیں اور مجھے اب (کچہری) جانا

چاہیئے۔ اس خط کے ساتھ ایک غزل ملفوف ہے جو حال میں "ادیب" میں شائع ہوئی ہے۔ میں نے اپنے دوست سردار امراؤ سنگھ کو (جنہیں غالباً آپ بھی جانتی ہیں) لکھا ہے کہ وہ مجھے ان اشعار کے اپنے انگریزی ترجمہ کی ایک نقل بھیج دیں جو میں نے (شہزادی دلیپ سنگھ کی ایک دوست) مس گوٹسمین کو لکھ کر دیئے تھے جب کہ انہوں نے شالامار باغ سے ایک خوبصورت پھول توڑ کر مجھے دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان اشعار کی اصل میرے پاس نہیں ہے۔ میں آپ کے لئے انہیں ڈھونڈ کر نکالوں گا۔

مہربانی کر کے ڈیر ہائی نیسز سے میرا سلام کہہ دیجئے اور مجھے شکر گزار بنایئے۔

آپ کا صادق

محمد اقبال

اب اقبال کلیتہً گہرے عمیق فلسفیانہ امور پر لکھنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر چکے تھے۔ مجھے انہوں نے بہت سی نظمیں اور نثر کے مضامین بھیجے۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے کوئی ایسا موقع یاد نہیں آتا جب کہ انہوں نے مجھے اپنی ادبی کاوشوں کے نمونے نہ بھیجے ہوں اور بعض اوقات تو انہوں نے مجھے وہ اہم نظمیں بھی بھیج دیں جو بالکل شائع نہیں ہوئی تھیں۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۱۱ء کی ڈاک میں اقبال کے پاس سے ایک نہایت دلچسپ مجموعہ آیا، بالخصوص وہ اشعار جنہیں وہ نغمہ میں ڈھلا ہوا بتاتے ہیں، اس تحریر کے ساتھ کہ کاش وہ میرے پاس ہوتے اور وہ اپنے مخصوص والہانہ لہجہ میں (جس کا تصور

اُنھوں نے اپنے ذہن میں قائم کر رکھا ہوگا، انہیں گا کہ مجھے سناتے۔ وہ خط یہ ہے :-

لاہور

۱۴ دسمبر ۱۹۱۱ء ڈیئر مس فیضی!

آپ کے نوازش نامہ کا جو مجھے ابھی ابھی ملا ہے بہت بہت شکریہ! مسز نائیڈو کو وہ نظم نہ دکھایئے۔ اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ وہ اردو شاعری کی قدر نہیں کر سکتیں۔

یہ ایک نظم ہے جو اب تک کہیں شائع نہیں ہوئی۔ یہ چند اشعار اور ہیں جو میں نے پرسوں علی الصبح ۴ بجے لکھے تھے۔ میں نے اس سے پہلے اس

لہ میرے خیال میں عطیہ بیگم صاحبہ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ مسز نائیڈو اقبال کے اشعار سے خوب لطف اندوز ہوتی تھیں۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اردو شاعری سے بھی شاعر ہونے کی وجہ سے استفادہ کرتی تھیں۔ انہیں فارسی کے بھی بہت سے اشعار یاد تھے جن کا وہ برمحل استعمال کیا کرتی تھیں۔ میرے خیال میں وہ اقبال کے کلام کی بے حد قدردان تھیں۔ راقم الحروف نے بمبئی میں متعدد مرتبہ مسز نائیڈو کو اقبال کا تازہ کلام سنایا اور انھوں نے نہ صرف ہمیشہ اسے گہری دلچسپی سے سنا بلکہ ایسی داد دی جس کی توقع صرف ایک شاعر ہی سے ہو سکتی ہے۔ (مترجم)

بحر میں لکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ یہ نہایت ہی ترنم ریز ہے۔ کاش میں وہاں ہوتا اور آپ کو اور بیگم صاحبہ کو گا کر سناتا۔

آپ کا صادق

محمد اقبال

مہربانی کر کے ورق اُلٹ کر دیکھئے۔

لاہور

۱۴۔ دسمبر

تقسیم بنگال یعنی ہندو بنگال کی مسلم بنگال سے علیحدگی ہندو بنگالی کے خیال میں ایک ایسا کاری زخم تھا جسے حکومت نے بنگالی قومیت کے جگر پر لگایا تھا۔ مگر حکومت نے دہلی کو شاہی شہر بنا کر نہایت چالاکی سے اپنی ہی کارروائی کو کالعدم قرار دے دیا ہے۔ بنگالی سمجھتا ہے کہ اسے بہت بڑی فتح حاصل ہوئی ہے، لیکن وہ اتنا نہیں سمجھا کہ اس کی اہمیت صفر کے درجہ تک گھٹا دی گئی ہے۔ اس بارے میں دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

مندمل زخمِ دلِ بنگال آخر ہو گیا
وہ جو تھی پہلے تمیز کافر و مومن گئی

تاجِ شاہی آج کلکتہ سے دہلی آ گیا
مل گئی بابو کو جوتی اور پگڑی چھن گئی

نوائے غم

زندگانی ہے مری مثلِ رباب خاموش!
جس کے ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش

بربطِ کون و مکاں جس کی خموشی پہ نثار
جس کے ہر تار میں ہیں سینکڑوں نغموں کے مزار

محشرستانِ نوا کا ہے امیں جس کا سکوت
اور منّتِ کشِ ہنگامہ نہیں جس کا سکوت

آہ! امید محبّت کی بر آئی نہ کبھی!
چوٹ اس ساز نے مضراب کی کھائی نہ کبھی

مگر آتی ہے نسیم چمن طور کبھی
سمتِ گردوں سے ہوائے نفسِ حور کبھی

چھیڑ آہستہ سے دیتی ہے مرا تارِ حیات
جس سے ہوتی ہے رہا روح گرفتارِ حیات

نغمۂ یاس کی دھیمی سی صدا اٹھتی ہے
اشک کے قافلے کو بانگ درا اٹھتی ہے

جس طرح رفعتِ شبنم ہے مذاقِ رم سے
میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے

محمد اقبالؔ

مسز نائیڈو صاحبہ کی خدمت میں سلام کہئے اور اُن کو یہ اشعار

دکھایئے۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ مس عطیہ آپ کو دکھاؤں گی۔

اقبالؔ

دُعا

یارب دلِ مُسلم کو وہ زندہ تمنّا دے
جو قلب کو گرما دے جو رُوح کو تڑپا دے

پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرّہ کو چمکا دے
پھر شوق تماشا دے پھر ذوقِ تقاضا دے

محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے

پیدا دلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر
اس محمل خالی کو پھر شاہدِ لیلا دے

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

آتش نفسی جس کی کانٹوں کو جلا ڈالے
اس بادیہ پیما کو وہ آبلہ پا دے

رفعت میں مقاصد کو ہم دوشِ ثریا کر
خودداریٔ ساحل دے آزادیٔ دریا دے

اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کر
وہ داغِ محبت دے جو چاند کو شرما دے

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اُجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

محمد اقبالؔ ۱۴۔ دسمبر ۱۹۱۱ء

نمودِ صبح

آتی ہے مشرق سے جب ہنگامہ در دامن سحر
منزل ہستی سے کر جاتی ہے خاموشی سفر
محفلِ قدرت کا آخر ٹوٹ جاتا ہے سکوت
دیتی ہے ہر چیز اپنی زندگانی کا ثبوت
چہچہاتے ہیں پرندے پا کے پیغامِ حیات
باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرامِ حیات
مسلمِ خوابیدہ! اُٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ نکل آئی سحر! گرمِ تقاضا تو بھی ہو
دورۂ عالم میں رہ پیما ہو مثلِ آفتاب
دامنِ گردوں سے ناپیدا ہوں یہ داغِ سحاب
کھینچ کر خنجر کرن کا پھر ہو سرگرمِ ستیز
پھر سکھا تاریکیٔ باطل کو آدابِ گریز
تو سراپا نور ہے زیبا ہے عریانی تجھے
اور عریاں ہو کے لازم ہے خود افشانی تجھے
ہاں نمایاں ہو کے برقِ دیدۂ خفاش ہو

اے دلِ کون و مکاں کے رازِ مضمر فاش ہو

محمد اقبال ۔ لاہور

یہ اشعار کل صبح ۱۳۔ دسمبر ۱۹۱۱ء کو لکھے گئے۔

کئی سال کے خلا کے بعد اقبال ستمبر ۱۹۳۰ء میں "ایوان رفعت" میں ہم سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے رہے اور اس حالت میں انہوں نے ایک کاغذ طلب کیا جس پر انہوں نے ذیل کے اشعار اپنے ہاتھ ——— سے لکھ کر عنایت کئے :-

بہ طوافِ کعبہ رفتم بہ حرم رہم نہ دادند
کہ بروں در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

برائے جریدہ

نترسم کہ تو می رانی زورق بسراب اندر
زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر

برکشت و خیاباں پیچ بر کوہ و بیاباں پیچ
برقے کہ بخود پیچد میرد بسحاب اندر

ایں صوتِ دل آویزے از زخمہ مطرب نیست
مہجور جناں حورے نالد برباب اندر

محمد اقبال

بمبئی ۱۰۔ ستمبر ۱۹۳۱ء   در دولت کدہ عطیہ بیگم

پرائیویٹ

عالم جوش جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہئے کیا حکم ہے؟ دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

بمبئی، ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء
محمد اقبال

جنوری ۱۹۳۱ء میں ایوانِ رفعت کے اونچے کھلے چبوترہ پر ہم سے ایک خاتون ملنے کے لیئے آئی ہوئی تھیں کہ اقبال آ گئے۔ نوجوان خاتون نے جن کی آواز بہت دل کش تھی ہمیں شام کے سکوت میں گا نا گا کر سنایا۔

اس کے چند دن بعد اقبال کے پاس سے ذیل کی نظمیں موصول ہوئیں[1]:

جہاں را بلندی و پستی توئی
ندانم چہ ای ہر چہ ہستی توئی

محرم در انتظار و دریں پردہ راہ نیست
یا ہست و پردہ دار نشانم نمی دہد

A SOLILOQUY

رخصت ہمیں ہاں دیں نہ چھوپی دیں نہ بید ردیں
حیران ہیں کیوں کہ رہِ معبود میں سر دیں

---

[1] بظاہر یہ نظمیں اور اشعار دوسرے شعرا مثلاً غالب وغیرہ کے ہیں۔ مترجم

فوجیں جو بڑھی آتی ہیں پس پا اُونہیں کر دیں
ایک آن میں یہ دشتِ غالاشوں سے بھر دیں
آفت میں کوئی پوچھنے والا ہی نہ ہوتا
اے کاش پھوپی نے ہمیں پالا ہی نہ ہوتا
کیسے یہ مصیبت فلکِ پیر نے ڈالی
جائیں گے کہاں جب نہ رہے سیّد عالی
نہ دوست، نہ غمخوار، نہ مولا، نہ موالی
یہ آج کا جینا نہیں دو حال سے خالی
یا دشت میں یا کوہ کے داماں میں رہیں گے
یا بیڑیاں پہنے ہوئے زنداں میں رہیں گے
پھر خاک ہے گر عمر ملی لاکھ برس کی
بلبل سے اب اوٹھتی نہیں تکلیف قفس کی
واں نہروں کو آتی ہے یہ آواز جرس کی
ایذا ہے مسافر کو فقط چند نفس کی
اس دن کے سوا توشۂ عقبیٰ نہ ملے گا
ڈھونڈے گا تو پھر قافلہ ایسا نہ ملے گا
اے سالک منہاج علی راہ دکھا دے
دروازۂ رحمت مجھے للّٰہ دکھا دے
جس در کا ہوں مشتاق وہ درگاہ دکھا دے

دربارِ شہنشاہ فلک جاہ دکھا دے
واں پہونچوں جہاں عرش بھی پایہ نہیں رکھتا
ہمسایہ ہیں اوس کا ہوں جو سایہ نہیں رکھتا

CHANGES IN LIFE

آں بلبلم کہ در چمستانِ روزگار
بود آشیان من شکن طرۂ بہار
وقت مرا روانی کوثر در آستین
بزمِ مرا طراوتِ فردوس در کنار
ہمواره محو مستی و محو سرور و ساز
پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مے و خمار
اکنوں منم کہ رنگ برویم نمی رسد
تا رُخ بخونِ دیدہ نشویم ہزار بار
پایم بہ گل ز حسرت گشت کنار جوی
خارم بدل ز یاد ہم آہنگی ہزار
داغے بدل ز فرقت وہلی نہادہ ام
کش غوطہ دادہ ام بجہنم ہزار بار
چشمم کشودہ اند بکردار ہائے من
ز آیندہ نا امیدم و از رفتہ شرمسار
دو برق فتنہ نہفتند در کف خاکے

بلائے صبر یکے رنج انتظار یکے

یادش بخیر تا چہ قدر سبز بودۂ

اے طرف جوئبار چمن جائے کیستی

از ہیچ نقش غیر نکوئی نہ دیدۂ

اے دیدہ محو چہرۂ زیبائے کیستی

رہزنانِ اجل از دستِ تو ناگاہ برند

نقدِ ہوشی کہ بسودائے بہاری ندہی

چوں زباں ہا لال و جاں ہا پُر ز غوغا کردۂ

بایدت از خویش پرسید آنچہ با ما کردۂ

گو نہ مشتاق عرض دستگاہ حُسن خویش

جان فدایت دیدہ را بہر چہ بینا کردۂ

زگل فروش شنیدم کہ اہل بازار ست

تپاک گرمی رفتار باغبانم سوخت

خاک و خون بادکہ در معرض اُثار وجود

زلف ور خسار شد سنبل و گل باز دہد

رُخ کشودند و لب ہرزہ سرایم بستند

دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند

خوش بود فارغ ز بند کفر و ایمان زیستن

حیف کافر مُردن و آوخ مُسلماں زیستن

مجھے یہ کہنے میں بالکل باک نہیں ہے کہ نشو و نما اور ارتقا پانے کی بجائے اقبالؔ کی خداداد غیر معمولی قابلیت گھٹ کر رہ گئی تھی اور اس تباہی کے ذمہ دار ہندوستان اور ہندوستان کے حالات ہیں جن کے ماتحت انہوں نے اپنی زندگی بسر کی۔ اقبالؔ فطرت کے پاس سے زبردست دماغی قابلیت اور غیر معمولی ذہانت لے کر آئے تھے۔ ان کا حافظہ بھی بہت قوی تھا۔ جس چیز کو وہ ایک مرتبہ پڑھ لیتے تھے، ان کے دماغ پر اس کا نقش ہمیشہ کے لئے بیٹھ جاتا تھا۔ معمولی بات چیت میں وہ بہت بذلہ سنج واقع ہوئے تھے اور ان کے مذاق میں ایک قسم کا گہرا استہزا ہوتا تھا اگرچہ اس میں تحقیر یا نفرت کا احساس بالکل نہ ہوتا تھا۔ جب کسی شہر یا مقام کا حال پڑھتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ شہر یا مقام ان کی نظروں کے سامنے موجود ہے۔ اس لئے کہ جب وہ فی الحقیقت اس مقام پر جاتے تو انہیں وہ جگہ مانوس سی معلوم ہوتی اور وہ اس کے بارے میں اس طرح سے ذکر کرتے گویا کہ پورے طور پر وہ اسے دیکھ چکے ہیں۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے اس وقت کا جب کہ وہ میونک کی سیر و تفریح کے وقت ہماری پارٹی میں موجود رہتے تھے۔ جو پروفیسر خواتین ہمارے ساتھ ہمارے تعلیمی دورہ پر ساتھ رہا کرتی تھیں وہ مختلف اداروں، عجائب خانوں، گیلریوں اور علمی جگہوں کے بارے میں اقبالؔ کی معلومات پر متعجب ہوا کرتی تھیں حالانکہ وہ وہاں صرف پہلی دفعہ گئے تھے اور ان جرمن پروفیسروں اور خصوصیت کے ساتھ حسین فراسینے شل اور فرا ویگے ناست کی معیت میں وہ ایسی ذہانت کے

جوہر دکھاتے تھے جس پر وہ خود اظہار تعجب کیا کرتی تھیں، اس لئے کہ یہ پروفیسر خواتین نہ صرف حسین تھیں بلکہ ایسی قابلیتوں کی مالک تھیں کہ فاضل سے فاضل اشخاص بھی ان کے سامنے ماند پڑ جاتے تھے۔ لیکن اقبالؔ ان میں رہ کر بھی ہمیشہ چمکتے تھے۔

جو واقعات یہاں بیان کئے گئے ہیں ان سے ہر شخص صحیح طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ آیا اقبالؔ کی ابتدائی سرگرمیاں اور کوششیں جو اُنہوں نے اپنے علم کو وسیع کرنے کے لئے کیں مکمل طریقہ سے بار آور ہوئیں یا نہیں یا یہ کہ وہ "وہ نہیں بن سکے جو" وہ بن سکتے تھے۔" اسی طرح یہ بھی فرض کیا جا سکتا ہے کہ بعض واقعات نے جو ان کی زندگی میں رونما ہوئے، ان کو ویسا بنا دیا جیسا کہ ہم اُنہیں اُن کی تحریرات میں پاتے ہیں۔ خواہ کچھ ہی ہوا ہو جو نمایاں مرتبہ اُنہوں نے حاصل کر لیا ہے وہی چیز اب سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ بہت سے اشخاص نے یہ مناسب خیال کیا ہے کہ ان کا مقابلہ دوسرے مصنفین سے کیا جائے لیکن میں سرے سے اس خیال سے نفرت رکھتی ہوں کہ بڑے آدمیوں کا باہم مقابلہ کیا جائے، اس لئے کہ ہر ایک بڑا شخص باقی اشخاص سے مخصوص طریقہ پر اپنے آپ کو ممیز کر لیتا ہے اور علمی اور ذہنی غور و فکر کی سلطنت میں اقبالؔ کی کامیابی بالکل انوکھی ہے۔ اگر آپ دیکھیں کہ اقبالؔ کے کسی مخصوص خیال کے ساتھ دوسرے کسی شاعر کا خیال مشابہت رکھتا ہے تو بدیہی طور پر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُنہوں نے اس خیال کو اس سے اخذ کیا ہے یا اس کا اثر

قبول کیا ہے۔ اگرچہ یہ یقینی ہے کہ جب کوئی شخص اپنے خیالات میں وسعت پیدا کرنے کی غرض سے دوسروں کے خیالات سے استفادہ کرتا ہے تو وہ ضرور ان سے متاثر بھی ہوتا ہے اور بعض اوقات روانی میں انہی خیالات کا اعادہ کر جاتا ہے۔ شیکسپیئر نے اپنے بہت سے ڈراموں کی بنیاد پلوٹیشو کی کہانیوں پر رکھی ہے لیکن پلوٹیشو کبھی بھی تخیل کی اس گہرائی تک یا ذہنی تخیل کی اس بلندی تک نہیں پہنچ سکا جس کا اظہار شیکسپیئر کی تصانیف سے ہوتا ہے یہ بھی دانشمندی نہیں ہے کہ مشرقی تخیل کو مغربی تخیل سے الگ اور مختلف سمجھا جائے۔ یہ سچ ہے کہ ان دونوں قوموں کے خیالات اور طریقہ بود و باش میں نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بہ وجہ اس ماحول کے جس میں وہ سویز کی دونوں جانب اپنی زندگی بسر کرتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں چھلکے کی صرف بیرونی سطح پر اثر پڑا ہے اور جونہی انسانی دماغ اس چھلکے کو چیرتا ہوا واقعات کی تہ تک پہنچ جاتا ہے اس وقت وہ اندر ایک ہی شے پاتا ہے خواہ وہ شخص مشرقی ہو یا مغربی۔

اقبال کا تخیل دنیا بھر کے دوسرے مصنفین کے مقابلہ میں بالکل اچھوتا تھا اور میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ اس امتیاز کی بنیادی وجہ اس علم میں مضمر ہے جو انہوں نے قرآنی تعلیمات سے اخذ کیا تھا۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ انہوں نے قرآنی الفاظ کے حقیقی مفہوم کا کلی طور پر احساس کر لیا تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنے بہت سے خیالات کی بنیاد اس مقدس اور الہامی کتاب پر رکھی تھی اور اسی علم کی بدولت ان میں زیادہ شان پیدا ہو گئی تھی۔

مثلاً ان کی "اسرار خودی" سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اس مکمّل آزادی کی عظمت کا پورا پورا احساس کر لیا تھا جو اس دنیا میں انسان کو ودیعت کی گئی ہے اور اسی آزادی کی بدولت وہ اس طاقت کو چھیننے کی بھی کوشش کرتے ہیں جو خالق کو اپنی مخلوق پر حاصل ہے جسے وہ اپنی طاقت خیال کرتے ہیں اور جس کے حصول میں وہ ناکام رہے ہیں۔ وہ پھر تشریح کے طالب ہوتے ہیں اور ہر اس چیز کو جو چھپی ہوئی ہے اور اُن کی نظروں سے پوشیدہ ہے معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور خالق سے بھی مبارزت طلبی کرتے ہیں اور اسے موردِ الزام قرار دیتے ہیں کہ اُس نے تخلیق کی نادیدہ رمزوں کو اُن سے کیوں چھپائے رکھا ہے۔ آخر میں وہ اعلان کرتے ہیں کہ ایسی خوبصورت زندگی بسر کر کہ اگر موت ہی سب چیزوں کا انجام ہو تو خود خُدا کو شرم محسوس ہو کہ اُس نے تیری زندگی کا خاتمہ کر دیا ہے ؎

چناں بزی کہ اگر مرگِ تست مرگِ دوام
خُدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

ہندوستان کی معاشرتی رسوم کا اگرچہ مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے تاہم ہندوستانی زندگی میں وہ نہایت اہمیت رکھتی ہیں اور ایک شخص مجبور ہو جاتا ہے کہ خاندان کی مرضی، خواہشات اور احکام کی پابندی کرے۔ اس چیز کی وجہ سے غیر معمولی ذہانت رکھنے والے بہت سے مردوں اور عورتوں کی زندگیاں تباہ و برباد ہو گئی ہیں اور اقبالؔ کی مثال ایک نہایت ظالمانہ ٹریجڈی کی حیثیت رکھتی ہے جو اسی قسم کی خاندانی ضد کا نتیجہ

تھی۔ جیسا کہ میں اقبالؔ کو یورپ میں جانتی تھی ہندوستان میں ان کی شخصیت کبھی ویسی نہ رہی اور جو لوگ اتنے خوش قسمت واقع نہیں ہوئے کہ وہ اُن کی ابتدائی زندگی میں ان سے ملے ہوں وہ کبھی بھی اس ذہانت اور قابلیت کا اندازہ نہیں کر سکتے جو فطرت کی طرف سے انہیں ودیعت کی گئی تھی اور جس کا وہ اظہار کر سکتے تھے۔ ہندوستان آکر اُن کی ذکاوت، طباعی اور آب و تاب کو گھُن سا لگ گیا تھا اور جُوں جُوں زمانہ گزرتا گیا یہ گھُن اُن کی ساری شعوری طاقت پر چھا گیا تھا۔ وہ اپنے خیال میں چند ھیائی ہوئی زندگی بسر کرتے تھے اور پستی سی محسوس کرتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ "وہ کیا کچھ بن سکتے تھے"۔ اب جب کہ میں یہ سطور لکھ رہی ہوں دو ایک ہندوستانی لڑکیوں کی مثالیں میری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں جو نہایت شریفانہ طبیعت رکھتی تھیں اور ایسی اعلیٰ ذہنی قابلیتوں کی مالک تھیں کہ وہ مطلوبہ بلندی تک پہنچ سکتی تھیں، لیکن انہیں ہر قسم کی قربانی دینی پڑی۔ صرف اس لئے کہ خاندان کی یہ خواہش تھی کہ وہ ایسے اشخاص سے بیاہی جائیں تاکہ سوسائٹی میں احترام کی نظر سے دیکھی جائیں گویا کہ خود ان کی زندگی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ بلکہ بڑوں کی نظروں میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ وہ سوچ بچار نہ کرنے والے گلے کے شوقِ تجسّس کو آسودہ کریں۔ اقبالؔ کی ٹریجڈی کو دیکھنے کے بعد میں اپنی ملّت سے اپیل کروں گی کہ وہ اسے خطرہ کی علامت سمجھیں اور نوجوان زندگیوں میں مداخلت کرنے سے پہلے سنجیدگی کے ساتھ اچھی طرح سے غور و فکر کر لیا کریں۔

ڈائری عطیہ بیگم

(پہلی اپریل ۱۹۰۷ء سے ۴ ستمبر ۱۹۰۷ء تک)

قارئین کی خدمت میں

اگرچہ میں نے اپنی تمہید میں اس ڈائری کے متعلق اشارہ کر دیا ہے تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پر مزید روشنی ڈالی جائے اس سے پہلے کہ قارئین کرام اس کا مطالعہ شروع کریں۔

یہ مختصر سی ڈائری ہے مگر تفصیلی ڈائری محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ کے پاس موجود ہے جسے غالباً وہ علیٰحدہ کتابی صورت میں شائع کریں گی۔ محترمہ فلسفہ وغیرہ کے مطالعہ کے سلسلہ میں اس زمانہ میں انگلستان میں قیام پذیر تھیں۔ جب کہ اقبالؔ بھی وہاں موجود تھے۔ اگر محترمہ اپنی یہ ڈائری نہ لکھتیں تو اقبالؔ کی زندگی کا وہ حصّہ محض تاریکی میں رہتا جو انہوں نے علم کے حصول کی خاطر انگلستان اور جرمنی میں بسر کیا تھا۔ اس ڈائری سے اقبالؔ کے ادبی اور سوشل مشاغل پر بھی روشنی پڑتی ہے اور ان اکابر سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے جن سے اقبالؔ کے تعلقات تھے۔ مثلاً بلگرامی اور عبدالقادر وغیرہ۔ ارنلڈ تو خیر ان کے استاد تھے ہی لیکن اس کے باوجود وہ جس محبّت اور احترام کے

ساتھ اقبالؔ سے پیش آتے تھے اور جس فراخدلی سے وہ اُن کی خداداد قابلیتوں کا اعتراف کرتے تھے وہ بجائے خود بہت سبق آموز ہے۔ اگر یہ ڈائری نہ ہوتی تو استاد و شاگرد کے اس باہمی سلوک کا اندازہ نہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ ڈائری" بقامت کمتر و لے بہ قیمت بہتر" کا حکم رکھتی ہے اور قارئین کرام کو پورے ذوق و شوق کے ساتھ اس دن کا انتظار کرنا چاہیئے جب کہ تفصیلی ڈائری شائع ہو ——— لیجئے! اب آپ ڈائری کا مطالعہ شروع کیجئے۔

ضیاء الدین احمد برنی

ڈائری عطیہ بیگم

لندن ـــــ پہلی اپریل ۱۹۰۷ء

آج مس بیک نے مجھے خاص طور سے یہ کہہ کر مدعو کیا کہ ایک ہوشمند پروفیسر جن کا نام اقبالؔ ہے، آپ سے ملنے کی غرض سے کیمبرج آرہے ہیں۔ میں گئی اور اقبالؔ تشریف لائے۔ میں نے انہیں بہت ہی فاضل شخص پایا۔ عربی، فارسی، سنسکرت سب بخوبی جانتے ہیں۔ بہت ہی ظریف اور باتونی واقع ہوئے ہیں۔ اقبالؔ نے فرمایا: "آپ اپنے سفر نامہ کی وجہ سے ہندوستان میں اور یہاں بہت مشہور ہو گئی ہیں۔ میں خاص کر آپ سے ملنے آیا ہوں اور مسز سید علی بلگرامی کی طرف سے دعوت نامہ بھی لایا ہوں کہ آپ کیمبرج آئیں اور ان کی مہمان بنیں اور آپ کا جواب بھی میں لے جاؤں گا"۔ میں نے پوچھا: "آپ کس غرض سے لندن آئے ہیں؟" کہا کہ "فلسفہ کا مجھے زیادہ شوق ہے۔ یورپ میں جو کچھ میسّر ہے اُسے حاصل کروں گا۔ جرمنی اور فرانس بھی جاؤں گا۔ وہاں بہت کچھ ہے جو یہاں پر نہیں ہے"۔ حافظؔ کے زیادہ شائق معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ حافظؔ کے حافظ تھے

اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ "جب حافظؔ کے رنگ میں ہوتا ہوں، اس وقت اُن کی سپرٹ مجھ میں آ جاتی ہے اور میں خود تھوڑی دیر کے لیے حافظؔ بن جاتا ہوں۔" مجھے بھی حافظ کا کلام یاد تھا۔ اُسے سُناتی رہی۔ میں نے کہا کہ "سفرنامہ جو "تہذیب نسواں" میں نکل رہا ہے وہ میری ہمشیرہ زہرہ بیگم صاحبہ کا ہے جو بہت قابل خاتون ہیں۔" انہوں نے فرمایا: "میں ایران میں رہ چکا ہوں اُن کو لکھئے کہ بابا فغانیؔ ضرور پڑھیں۔ وہ دیوان قدرے نایاب تو ہے مگر وہ اسے ڈھونڈ نکالیں اور پڑھیں۔ ہندوستان میں اُن کے اشعار کو کوئی نہیں جانتا کہ بابا فغانیؔ کتنے بلند پایہ شاعر ہیں۔"

○

لندن —— ۹۔ اپریل ۱۹۰۷ء

آج اقبالؔ نے مجھے فراس کاٹی (FRASCATI) میں رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ کھانوں کی فہرست اور پھولوں کی سجاوٹ کو دیکھ کر میں دنگ رہ گئی۔ ہر رنگ اور ہر قسم کے کھانے بے حد لطیف اور لذیذ تھے۔ یہ سب کھانے انہی کی فرمائش سے تیار کیے گئے تھے۔ جب ان کی تعریف میں میں نے چند جملے کہے تو انہوں نے کہا، "میں دو شخصیتوں کا مجموعہ ہوں۔ ظاہری شخصیت ہر اُس چیز کی قدردان ہے جس کی قدر کرنی چاہیئے اور جو کارآمد اور عملی ہے۔ دوسری اور باطنی شخصیت خواب دیکھنے والے فلاسفر اور صوفی کی سی ہے۔"

○

لندن —— ۱۵-اپریل ۱۹۰۷ء

آج اقبالؔ کے لیے میں نے ایک ٹی پارٹی ترتیب دی جس میں مس سلوسٹر اور مس بیوی جیسی مشہور خواتین بھی شریک تھیں جنہوں نے علم، ادب اور فلسفہ کے امتحانات پاس کیے تھے اور ایم بینڈل اور ہیر لیتھ روز جیسے وائلن اور پیانو کے ماہر بھی شریک تھے۔ اقبالؔ کی ظرافت کا کیا پوچھنا ہے: ہر ایک کی ہجو میں اشعار کہتے اور ایک غزل لکھ کر مجھے اسی وقت دی۔ ان خواتین نے بھی خوب ہی عالمانہ اور ظریفانہ جواب دیئے۔ وہ بھی علم کی مخزن تھیں۔ سوال و جواب اس قدر جلد ہوتے تھے کہ ان کا قلمبند کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ میں نے اقبالؔ سے کہا کہ یہ سب باتیں لکھ دیں تو جواب دیا کہ "کیا فائدہ؟ مناسب موقع پر جو کچھ کہا گیا وہ سب نے سن لیا۔ بس یہی کافی ہے۔ ان باتوں کو قلمبند کرنے کی مطلق ضرورت نہیں۔" ۹ بجے یہ عالمانہ مجلس ختم ہوئی۔ اقبالؔ بھی سب سے مل کر بے حد خوش ہوئے اور اس کا انہوں نے اظہار بھی کیا۔

○

لندن —— ۲۲ اپریل ۱۹۰۷ء

آج اقبالؔ مجھے لینے کے لیے آئے۔ میں ان کے اور عبدالقادر صاحب کے ہمراہ کیمبرج گئی۔ ماشاء اللہ! ان دونوں کی فصاحت اور بلاغت کا کیا کہنا۔ سارے راستہ ظریفانہ اور عالمانہ باتیں ہوتی رہیں۔ ۱۲ بجے سیّد علی بلگرامی صاحب کے مکان پر پہنچے۔ دن بھر وہاں مشاہیر آتے جاتے رہے

وقت لطف سے کٹ گیا۔ مگر اقبالؔ کی سنجیدہ ظرافت اور شوخی کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بظاہر قدرے خاموش اور سُست، مگر جہاں کسی نے کچھ کہا، بجلی کی تڑپ سے اُس پر ایک نہ ایک فقرہ کس دیتے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ ان کا کلام لکھ لیا کروں گی، مگر اُنہوں نے روک دیا یہ کہہ کر کہ یہ باتیں وقتی ہوا کرتی ہیں۔ اسی دن میں لندن واپس آ گئی۔ یہ دن ہمیشہ یاد رہے گا۔

○

کیمبرج —— پہلی جُون ۱۹۰۷ء

آج ندی کے کنارے درخت کے سایہ میں بہت بڑی پکنک پارٹی جمع ہوئی۔ پروفیسر آرنلڈ نے زندگی اور موت کے مسائل پر بہت کچھ باتیں کہیں۔ آخر میں اقبالؔ نے ایک بات کہی جس کے بعد بحث ختم ہو گئی۔ اُنہوں نے فرمایا: "زندگی موت کی شروعات ہے اور موت زندگی کی۔" یہ جملہ کہتے وقت ایک قسم کی تمسخرانہ مسکراہٹ اُن کے چہرے سے نمایاں تھی۔

○

لندن —— ۱۹۔ جُون ۱۹۰۷ء

"پروفیسر آرنلڈ نے مجھے اور اقبالؔ کو رات کے کھانے پر بلایا۔ اثنائے گفتگو میں پروفیسر آرنلڈ نے کہا: "مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ جرمنی کے ایک مقام میں نایاب مخطوطات دریافت ہوئے ہیں اور ضرورت ہے کہ معلوم کیا جائے کہ وہ کیا ہیں۔ اقبالؔ! میں تمہیں وہاں بھیجنے کا خیال کر رہا ہوں اس لئے کہ تم ہی اس کام کے لئے نہایت موزوں ہو۔" اقبال نے جواب

دیا: "میں آپ کا شاگرد ہوں اور آپ میرے استاد ہیں۔ شاگرد اپنے استاد کے سامنے کیا کر سکتا ہے؟" پروفیسر آرنلڈ نے کہا کہ "بعض اوقات شاگرد استاد سے بڑھ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ شاگرد کو اپنے استاد کا کہنا ماننا چاہیئے۔" اقبال نے جواب دیا: "استاد کا علم شاگرد سے زیادہ ہوتا ہے اور اگر آپ کا یہی فیصلہ ہے تو میں آپ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔"

اقبال نہایت شائستہ اور مہذب تھے اور ہمیشہ باموقع بات کرتے اور معقول۔

O

لندن ـــــ ۲۰۔ جون ۱۹۰۷ء

آج شام کو اقبال چند عربی اور جرمن فلاسفروں کی کتابیں لائے اور سب میں سے تھوڑا تھوڑا سنایا۔ میں دیکھتی ہوں کہ اقبال جرمن فلاسفروں کی کتابوں سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں۔ فارسی شعرا میں زیادہ تر حافظ کا کلام سناتے رہے۔ تین گھنٹے تک برابر بحث رہی۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ "اس طرح سنانے اور بحث کرنے سے میرے خیالات پختہ ہو جاتے ہیں۔"

O

لندن ـــــ ۲۳۔ جون ۱۹۰۷ء

آج پونے تین بجے سے میرے یہاں مہمان آنا شروع ہو گئے ہندوستانی امارت پسند اور دلدادۂ فیشن۔ ڈاکٹر انصاری نے خوب گانا سنایا۔ سنہا کی

پو تینوں کمولا اور رمولا نے بھی گانا گایا اور باجا بجایا۔ اقبال کی طبیعت بظاہر اس قسم کے مجمعوں سے سست اور اچاٹ ہو جاتی ہے، مگر در اصل ایسا نہیں ہے۔ ذرا موقع ملا تو اُنہوں نے اپنے ہجو کے برجستہ اشعار ہر ایک کی شان میں سنائے جن سے اُن کی باریک بینی کا کمال ظاہر ہوتا تھا۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ میں نے لکھنے کے لیئے پنسل کاغذ نکالا، مگر عادت کے مطابق اُنہوں نے یہ کہہ کر روک دیا کہ "یہ باتیں فقط وقتی ہوتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ کسی کو خیال نہ ہونا چاہیئے کہ یہاں ایسے شوقین اور گہری دلچسپی رکھنے والے شاہد موجود ہیں"

○

لندن ــــ ۲۷ جون ۱۹۰۷ء

اقبال آئے اور مجھے اپنے مکان پر لے گئے جو ایک جرمن خاتون مس شولی کے زیر انتظام تھا۔ بہت عمدہ اور نئے نئے قسم کے کھانے پکائے تھے۔ یہ بہت ہوشیار خاتون ہے۔ اقبال کا علمی مقالہ مکمل ہو چکا ہے۔ اُنہوں نے شروع سے اخیر تک اپنی تحقیقات کا خزانہ سنایا۔ میری رائے پوچھی تو میں نے چند باتیں کہیں جنہیں اُنہوں نے قلمبند کر لیا۔ اس کے بعد ہم امپیریل انسٹی ٹیوٹ کے سالانہ جلسہ میں گئے جہاں شہزادیاں بھی آئی تھیں۔ اقبال نے حسب عادت خوب فقرے کسے۔ جو سنتا ہنس پڑتا۔ الغرض جب واپس ہونے لگے تو کہا: "مسرت بخش تضیع اوقات"۔ سوسائٹی میں اقبال کے بارے میں یہ شہرہ تھا کہ وہ لندن میں سب سے تیز طبیعت رکھنے والے ہندوستانی ہیں

لندن ـــــ ۲۹۔ جون ۱۹۰۷ء

آج لیڈی ایلیٹ کے فیشن ایبل "ایٹ ہوم" میں مس سروجنی دائی بھی آئی تھی۔ یہ میری ہم سفر تھی بہت مالدار، غضب کے کپڑے اور زیور پہنے ہوئے حد سے زیادہ بناؤ سنگار کیے ہوئے، اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھ رہی تھی۔ جب اقبال اور میں کمرے میں داخل ہوئے تو مجھے بالکل نظر انداز کرتے ہوئے اُن کے پاس جھپٹ کر پہنچی اور کہا: "او مسٹر اقبال! میں صرف آپ سے ملنے کے لئے آئی ہوں۔" اقبال نے فوراً جواب دیا: "اگر یہ میری عزت افزائی ہے تو پھر میں اس کمرے سے زندہ نہ نکل سکوں گا۔"

○

لندن ـــــ ۴۔ جولائی ۱۹۰۷ء

اقبال پونے تین بجے مجھے لینے کے لئے آئے اور میں ان کے ہمراہ ان کے یہاں گئی۔ چائے وہیں پی اور لذیذ کھانا بھی وہیں کھایا جسے مس شولی نے پکایا تھا۔ اقبال کی تاریخ تیار ہو چکی ہے اور انہوں نے وہ شروع سے آخر تک مجھے سنائی۔ جب میں نے ایک دو ریمارک کئے تو کہا کہ "ہر شخص ایک چیز کو اپنے ہی خیال کے مطابق دیکھتا ہے مگر میں دنیا کی تاریخ کو اس طرح دیکھتا ہوں۔" ماشاء اللہ! کیا حافظہ ہے!! اقبال علم کا مخزن ہیں۔ انہوں نے تاریخ نئے زاویہ سے لکھی ہے۔ اقبال نے ہندوستانی کھانے خود مس شولی کو سکھائے ہیں۔ وہ بہت مزیدار کھانے پکاتی ہیں۔ ہر فن میں ماہر ہیں۔

لندن ـــــ ۱۳، ۱۴ و ۱۵۔ جولائی ۱۹۰۷ء

اقبالؔ نے یہ طے کیا ہے کہ ہم روزانہ ان کے مکان پر دو گھنٹے کے لئے ۵ سے ۷ تک جائیں۔ ہیر شکان جو ابھی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے کر جرمنی سے آئے ہیں، بہت ہوشیار اور دلچسپ آدمی ہیں۔ وہ اور اقبالؔ فلسفہ اور شاعری کے سبق پڑھتے اور پھر اُن پر بحث کرتے۔ یہ سبق برابر روزانہ چلتے تھے اور اس قدر دلچسپ ہوتے تھے کہ بیان سے باہر ہے میں نے معلوم کیا کہ اقبالؔ اپنے افکار عالیہ میں جرمن فلسفہ اور شاعری کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ تاریخ سے بھی لگاؤ ہے۔ وہ کہتے تھے کہ "اگر علم کو پختہ کرنا ہو تو جرمنی جاؤ۔" میں نے کہا کہ "اس طرح پڑھنے اور بحث کرنے سے ایک نئی دنیا سامنے آجاتی ہے۔" اقبالؔ نے جواب دیا کہ "درحقیقت اس طرح سکھانے سے میں خود سیکھتا ہوں۔"

○

لندن ـــــ ۱۶۔ جولائی ۱۹۰۷ء

آج اقبالؔ نے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا "پولٹیکل اکانومی" کا نسخہ مجھے دیا۔ کتنے مہربان ہیں! اور وہ علمی مقالہ بھی مجھے بخشا جس کے لکھنے پر انہیں بی اے کی ڈگری عطا ہوئی۔ عام طور سے یہ بات مشہور ہے کہ اقبالؔ بہت ہی فاضل اور تیز فہم اسکالر (طالب علم) ہیں۔ اس مقالہ کا ترجمہ جرمن زبان میں ہو رہا ہے۔

لندن ـــــ ۲۲۔ جولائی ۱۹۰۷ء

آج ایک علمی مذاکرہ ہوا جس میں اقبالؔ کی نظمیں گائی گئیں۔ ایک بہت ہی ہوشیار طالب علم پرمیشور لال نے "مخزن" کے مضامین اور خطوط سُنائے جن میں یہ لکھا تھا کہ اقبالؔ نے قومی نظمیں کہہ کر دنیا میں ایک نئی روشنی پھیلائی ہے۔ تمام شمالی ہندوستان میں گویا جوش کا زلزلہ پیدا ہو گیا ہے۔ گلی کوچوں اور شاہراہوں میں ان کی نظمیں پڑھی جاتی ہیں۔ ان کی نظمیں خاص کیفیت اور اثر پیدا کرتی ہیں اور ساری قوم وجد میں آگئی ہے۔

میں نے وہ خط پیش کیا جسے اقبالؔ نے مجھے جرمنی سے جرمن زبان میں لکھا تھا۔ اسے سُن کر سب نے واہ وا کی۔

○

ومبلڈن ـــــ ۲۔ اگست ۱۹۰۷ء

میں اور اقبالؔ پہلے سے انتظام کر کے پروفیسر آرنلڈ کے یہاں ومبلڈن گئے۔ میاں بیوی دونوں فرشتہ ہیں اور ایک مقدّس جنت میں رہتے ہیں ان کی نو سالہ لڑکی بھی ماں باپ کی طرح ذہین ہے اور ایک چمکتی ہوئی تتیری کی طرح ادھر سے اُدھر پھدکتی پھرتی ہے۔ ہم سب بہت جلد دوست بن گئے۔ اقبالؔ نے یہ بھی انتظام کیا تھا کہ مس اسٹریٹن بھی وہاں موجود ہیں اکثر اقبالؔ کی ذہانت کا تذکرہ رہتا۔ پروفیسر آرنلڈ نے کہا کہ "اقبالؔ کی خوشی ہے کہ آپ ہائیڈلبرگ جائیں اور میں بھی کہوں گا کہ آپ ضرور جائیں"۔ پروفیسر آرنلڈ کو اقبالؔ سے بے حد محبت ہے اور وہ ان کی بہت عزّت

کرتے ہیں۔ پھر اُنہوں نے کہا کہ "میں ان کا پروفیسر تھا اور اقبالؔ میرے خاص شاگرد تھے۔ مگر ان کی عقل اور سمجھ اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ میں پڑھاتے پڑھاتے خود سیکھتا چلا جاتا تھا۔ اقبالؔ بہت بلند پایہ قابلیت رکھنے والے شخص ہیں۔ رفتہ رفتہ تمام دنیا ان کی قدر کرنے لگے گی۔" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ "آپ خوش نصیب ہیں کہ اُنہوں نے آپ کو ایسا معقول خط لکھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس چھٹی کو میں اپنے مجموعہ میں شامل کر لوں۔ اس لئے کیا آپ ازراہ مہربانی وہ خط مجھے عنایت کر دیں گی؟" ایک بزرگ سمجھ کر اور موقع کی نزاکت کا خیال کر کے میں نے چُپ چاپ اقبالؔ کا خط اُن کو دے دیا۔

○

لندن ——— ۱۰۶ اگست ۱۹۰۷ء

آج اقبالؔ کا خط آیا ہے جس میں مجھے تین ہفتہ کے لئے اپنا مہمان بنانے کی دعوت دی گئی ہے۔ وہ مجھے برلن، ہائیڈلبرگ، میونک اور لیپزگ کی لائبریریاں اور عجائب گھر دکھانا چاہتے ہیں۔ اُنہوں نے ان سب کی فہرستیں جمع کر لی ہیں۔ باقی وہاں چل کر دکھائیں گے۔ چند کتابوں کی تفسیر کس خوبی سے لکھی ہے میں نے جواب میں لکھا ہے کہ ۱۹ تاریخ کو یہاں سے چلوں گی اور ان کی ہدایت کے مطابق کاغذات بھی ہمراہ لاؤں گی۔

○

ہائیڈلبرگ ——— ۱۹ و ۲۰ اگست ۱۹۰۷ء

ہم ۱۹ ویں تاریخ کو پانچ چھ اشخاص کی ٹولی میں لندن سے نکلے اور

۲۰ اگست کو ٹھیک پانچ بجے ہائیڈلبرگ کے خوبصورت شہر میں پہنچ گئے وہاں کی یونیورسٹی کے بہت سے لوگ استقبال کے لئے آئے اور ان میں سب سے نمایاں اقبال تھے۔ جنہیں ہیر پروفیسر اقبال کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اقبال نے بے حد ممنونیت اور خوشی کا اظہار کیا، ور سب کا تعارف کرایا۔ سارا قافلہ چل کر مکان پر پہنچا۔ اقبال مجھے اور دو پروفیسر لڑکیوں کو جن کے نام ڈیگمے ناست ——— اور سینے شل ہیں، لے کر گروپ کے آگے آگے چلے۔ اقبال ہر موقع پر پیشوائی کے فرائض ادا کرتے ہیں۔ میرے آنے سے بے حد خوش ہوئے اور کہا کہ "جو جو کام مجھے کرنے ہیں وہ اب بالکل مکمل ہو جائیں گے۔" ہم سب یونیورسٹی کے باغ میں جا کر بیٹھے اور بہت مزیدار کافی پی، اور دوسری لذیذ چیزیں بھی کھائیں۔ میں اقبال کو اس قدر بے تکلف دیکھ کر حیران ہو گئی۔ پکانے میں خود شریک ہوتے اور گھر کے ہر کام میں بھی حصّہ لیتے۔ وہاں کی فضا ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ ایک باقاعدہ منظم اور مہذب گھر معلوم ہوتا ہے جس میں طالب علم اور پروفیسر ہر شعبہ میں سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔ البتہ ہیر پروفیسر اقبال نہایت ذہین شمار کئے جاتے ہیں۔ مگر یہ دونوں جوان اور بے حد خوبصورت لڑکیاں ڈیگمے ناست اور سینے شل ان کو برابر سبق دیتی ہیں اور اقبال ان ہی سے جرمن اور دقیق مضامین سیکھتے ہیں۔ پڑھنے پڑھانے کے اوقات صبح سے رات تک ہیں۔ اس میں استاد کشتی رانی میں شریک، پیدل سیر میں شریک رہتے ہیں۔ دریا کے کنارے بیٹھ کر کلاسیکل موسیقی کا دور چلتا ہے۔ خود فراہیرن جو تقریباً ۱۰۰ پروفیسروں اور طالب علموں کو یونیورسٹی ہوسٹل میں

رکھتی ہیں اور جن کی عمر ۷۰ سال سے اُوپر ہے، سب سے ذہین اور کمال کی موسیقی دان ہیں۔ اقبالؔ ہر کام میں ایک بچے کی طرح شریک رہتے ہیں اور دانشمندانہ طریقہ سے دلچسپی لیتے ہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اوقات کے پابند نہیں ہیں اور اِن کے لئے ٹھہرنا پڑتا ہے۔ مگر سب لوگ اس بات سے واقف ہیں اور اس کے باوجود اقبالؔ کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہاں پر میں نے ان میں ایک غیر معمولی بات دیکھی یعنی طبیعت کی سادگی اور تحمل۔

○

ہائیڈلبرگ ——— ۲۱۔ اگست ۱۹۰۷ء

یہاں اساتذہ کو کھانے پینے اور قیام کرنے کا کچھ دینا نہیں پڑتا۔ وہ مفت رہتے ہیں۔ انہیں اور بھی بے شمار مراعات حاصل ہیں۔ آج دن بھر کے سبقوں کے بعد اقبالؔ فرالائن پروفیسر ویگے ناست اور سینئر شل کو ندی کے کنارے قہوہ خانہ میں لے گئے اور فرانسیسی، یونانی اور جرمن فلسفہ پر بحث شروع کی۔ یہ لڑکیاں تینوں زبانیں بہت اچھی طرح سے جانتی ہیں۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ اقبالؔ نہایت منکسر المزاجی سے ایک لفظ کہے بغیر اُن کی باتیں سنتے اور اپنے خیالات میں اس قدر غرق رہتے تھے کہ جب جانے کا وقت ہوا تو اس وقت ایسا محسوس ہوا گویا کہ وہ خواب سے اٹھے ہیں۔ برعکس اس کے لندن میں بڑے خود رائے تھے، مگر یہاں بات بات سے اُن کی منکسر المزاجی ظاہر ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر میں سب آکر

شریک ہو گئے۔ اور ہم ندی کے اس پار جا کر ایک اُونچی چڑھائی پر چڑھے جس کی کوئی ایک ہزار کے قریب سیڑھیاں ہوں گی۔ وہ چڑھے اور سیبے شل نے آپیرا موسیقی شروع کر دی اور یوں گاتے بجاتے اُوپر پہنچے۔ سب سے کہا گیا کہ اس کی تاریخ بتاؤ۔ اقبال کی تاریخ درست نکلی کہ وادیِ نیکر کا سب سے اچھا نظارہ یہاں سے نمایاں ہے۔ لہذا یہ شلوس فلاں سال میں فلاں نے بنایا۔ اقبال کورس (CHORUS) میں بھی شریک ہوئے مگر آواز ندارد! بالکل بے سُرے تھے مگر شریک ضرور ہوتے۔

○

ہائیڈلبرگ — ۲۲۔ اگست ۱۹۰۷ء

آج علی الصبح ہم سب تیار ہو کر جمع ہوئے۔ دیکھا تو اقبال ندارد ہیں! سب اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ گاڑی کا وقت ہوا جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک خادمہ چلّاتی ہوئی آئی اور کہا کہ "معلوم نہیں، ہیر پروفیسر کو کیا ہو گیا ہے" خیر اُن کے کمرے میں گئے۔ دُور سے دیکھا کہ بتی جل رہی ہے اور اقبال ایک ہاتھ سر پر رکھے ہوئے بیٹھے ہیں۔ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور دو چار کھلی ہوئی کتابیں میز پر پڑی ہیں۔ جب ذرا زور سے انہیں پکارا تو بھی جواب ندارد۔ آگے بڑھنے کی کسی میں ہمت نہ ہوئی۔ فرا ہیرن نے آخر کار مجھ سے کہا کہ "آپ ہی اندر جا سکتی ہیں۔" خیر میں آہستہ آہستہ گئی، پکارا! جواب ندارد۔ زور سے آواز دی۔ پھر بھی صدائے بر نخاست۔ غور سے دیکھا تو سانس چل رہا ہے مگر خلا میں کچھ دیکھ رہے ہیں۔ خیر میں نے ان

کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں جھنجھوڑا اور اقبالؔ، اقبالؔ کہہ کر پکارا تو تھوڑی دیر کے بعد وہ ہوش میں آئے۔ اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہاں ہیں پھر کچھ یاد کر کے کہا کہ "میں عالم بالا میں چلا گیا تھا۔" میں نے کہا کہ "آپ کے لئے ٹرین ٹھہر نہیں سکتی۔ ذرا جلدی سے آیئے۔" خیر! بہت مسکراتے ہوئے باہر آئے اور ہم سب روانہ ہوئے اور کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد نائن مائل پہنچے۔ وہاں سے تین چار میل کی چڑھائی چڑھ کر پہاڑ کی چوٹی پر گئے جہاں ایک ہوٹل واقع ہے۔ میں نے اقبالؔ سے کہا: "یہ کیا شعبدہ بازی تھی؟" انہوں نے جواب دیا: "میں فلاں فلاں کتابیں رات کو پڑھ رہا تھا۔ اتنے میں خیال میرے جسم سے الگ ہو گیا اور میں عالمِ بالا میں چلا گیا اور وہاں پہنچ کر بھی میری حالت پریشان تھی کہ اتنے میں آپ نے مجھے نیند سے جگا دیا۔" میں چُپ چاپ سنتی رہی اور وہ رفتہ رفتہ اپنی اصلی حالت پر آ گئے اور ہنسی مذاق کرنے لگے اور کھانے اور گانے دونوں میں شریک ہوئے یکایک فراویگے ناست نے گانا شروع کیا۔ ع

گجرا بیچن والی نادان، یہ تیرا نخرا

جس میں سب نے ساتھ دیا۔ اقبالؔ کی آواز نکل نہیں رہی تھی مگر ان میں کلاسیکل موسیقی سمجھنے اور اس کی قدر کرنے کا مادّہ ضرور تھا۔ یہ گانا میں نے سکھایا تھا۔ جب ہم سب نے پہاڑوں پر سے بہت سے پھول جمع کر کے مکٹ بنا کر سروں پر پہنا۔ اس وقت سب سے پہلے پھولوں کا مکٹ اقبالؔ کے سر پر رکھا گیا اور کہا گیا کہ ہم آپ کو معلوم اور نامعلوم دنیا

کی بادشاہت کا تاج پہناتے ہیں۔" اس پر خوب مذاق رہا۔ اس ہوٹل سے ہم نے سب کو رنگ برنگ کے کارڈ روانہ کئے۔ اقبالؔ نے بھی تین پوسٹ کارڈ بذریعہ ڈاک بھیجے۔ گرانڈ ڈیوک آف ہیس کے دیہاتی مکان کو بھی خوب دیکھا ——

ہائیڈلبرگ —— ۲۳ اگست ۱۹۰۷ء

آج ہمارا قافلہ پونے تین بجے روانہ ہو گیا اور ہم سات بجے اپنے مکان پر پہنچ گئے۔ یہ سیر سپاٹے سیکھنے کی غرض سے کیے جاتے ہیں اور قافلہ سالار ہمیشہ اقبالؔ ہوا کرتے ہیں۔ وہ مختلف مقامات کا تاریخی حال بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور ان کی بھولیں دوسرے پروفیسر درست کر دیتے ہیں۔ جب تاریخی بیان ختم ہو جاتا ہے تو اوپیرا اور موسیقی کا دور چلتا ہے۔ تمام باتیں قاعدے سے ہوتی ہیں۔ اس کے بعد بجلی کی گاڑی میں بیٹھ کر جھٹ پٹ ایک پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے جس کا نام ہے کونگ اسٹال (یعنی بادشاہ کا قدمچہ) اقبالؔ اس پر بیٹھے اور اُنہوں نے کچھ اشعار ہر ایک کی شان میں کہے۔ ہندوستانی بہت ہنسے۔ جرمن اور دوسرے لوگ سوال کرنے لگے تو اُن کے جواب میں اقبالؔ نے کہا کہ "میں آپ کو آسمانی زبان میں حکم دیتا ہوں کہ آپ میجک سرکل بنائیں اور ہمیں فرشتوں کا نغمہ سنائیں۔" اس حکم کی تعمیل فوراً ہوئی اور کسی اوپیرا کا ایک حصہ ہم سب نے ایکٹ کر کے گایا اور بجایا۔ اس کے بعد کوہ لوف گئے جو تین میل دور تھا۔ یہ سارا

علاقہ کسی زمانہ میں ایک بادشاہ کے باغات میں شامل تھا جن میں وہ چہل قدمی کیا کرتا تھا۔ ان باغات کو بارہ دریوں سے سجایا گیا تھا۔ گرد و پیش کے منظر کا کیا پوچھنا! اقبالؔ کی ظرافت کا کیا ٹھکانا!! ہر کام میں طالب علموں کی طرح شریک ہیں مگر اپنی باوقار شخصیت کی وجہ سے سب سے نمایاں ہیں اور اُن کی مرضی کے خلاف کوئی کچھ نہ کرتا۔ مگر وہ کسی کو ناراض نہ کرتے بلکہ شوق سے ہر کام میں شرکت کرتے۔ واپسی کے وقت ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دو تین کی صف بنا کر دوڑتے ہوئے سات بجے آئے۔ نہ معلوم کتنے میل چلے ہوں گے۔ کل کے لئے مقرر ہوا ہے کہ سوال و جواب ہوں گے۔

○

ہائیڈلبرگ ——— ۲۵۔اگست ۱۹۰۷ء

آج شمال کی سمت ٹرین میں سوار ہو کر ایک گھنٹہ میں اس جگہ پہنچے جہاں کسی بادشاہ نے اپنے "باغ فردوس" میں ہر ملک کے لئے عبادت گاہیں بنائی تھیں اور ایک مسجد بھی تعمیر کی تھی۔ یہاں یونانی مجسمے ہیں اور اپالو دیوتا کا معبد بھی موجود ہے۔ آبشار، تالاب اور پھل دار درخت بھی ہیں جہاں طرح طرح کے پرندے نغمہ سرائی کرتے ہیں۔ آخر ایک جگہ گئے جو مسجد نما عمارت تھی۔ کہتے ہیں کہ اس بادشاہ کو اسلام سے زیادہ دلچسپی تھی اور اسی لئے اُس نے ایک بہت خوبصورت مسجد بھی تعمیر کی تھی۔ اس میں عربی میں اللہ کے نام لکھے ہوئے تھے اور کچھ سورتیں بھی کندہ تھیں جنہیں اقبالؔ نے پڑھ

کر سُنایا اور نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس کی تاریخ یوں بیان کی: "ایک مسلمان عورت تھی۔ اُس نے بادشاہ سے کہا کہ اچھا میں تمہاری بیگم بنوں گی اگر تم مسلمان ہو جاؤ گے اور ایک مسجد بناؤ گے جہاں ہمارا تمہارا نکاح ہوگا اس لئے فوراً یہ مسجد تعمیر کرائی گئی اور یہیں گویا اُن کا نکاح پڑھوایا گیا۔" سب یہ کہانی سُن کر حیران ہو گئے۔ کسی کو بھی یہ حال معلوم نہ تھا۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ مگر کہتے بھی تو کیا کہتے۔ پھر اقبال نے کہا کہ "مجھے بہت سے اندرونی حالات معلوم ہو جاتے ہیں جو آپ کو معلوم نہیں ہو سکتے۔" اس طرح ہر وقت ہر لحظہ سب پر دھونس جماتے۔ لوگ اگر سمجھتے بھی تو منہ پر کچھ نہ کہتے اس لئے کہ اقبال سے سب کو محبت تھی اور سب اُن کی عزت کرتے تھے۔ ہم لوگوں کا دم مارے ہنسی کے گھٹ جاتا مگر اُن کے چہرے پر ذرا بھی تبدیلی پیدا نہ ہوتی۔

○

ہائیڈلبرگ — ۲۶۔ اگست ۱۹۰۷ء

فراہیرن نے کہا کہ فلاں گاؤں میں جو پہاڑ کی چوٹی پر ہے، آپ سب چلیئے اور دیہاتی ناچ دیکھئے جو سال میں ایک مرتبہ ہوتا ہے۔ اِن پر مضمون بھی لکھئے اور ان کی تصویر بھی بنا لیجئے۔ ہم کوئی ۱۰۰ آدمی تھے۔ ہنستے کودتے، گاتے کھاتے ٹرین میں سوار ہوئے۔ جرمن لوگ بھی کیسے بے تکلف اور ذہین ہوتے ہیں ——— واللہ! چوٹی پر پہنچے جہاں پُرانے کھنڈرات کو ایک میوے کے باغ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ وہاں ہم سب

نے توڑ توڑ کر انگور، بیر، ناشپاتی اور امرود کھائے۔ اطراف دجوانب کے کسان رنگ برنگ کا خوبصورت لباس پہنے ہوئے آئے اور مروجہ دیہاتی ناچ ناچے۔ بعض کی آواز ایسی تھی کہ وادی گونج اٹھتی تھی۔ ہم سب نے اپنے اپنے تاثرات تحریر کیئے۔ میں نے ہندوستان سے دیہاتی ناچوں اور موسیقی پر کچھ لکھا اور کچھ اسکیچ بنائے۔ جب مکان پر آئے تو فراہیرن نے کہا کہ سناؤ اور اپنی تصویریں دکھاؤ۔ اقبالؔ کی طرف بھی دیکھا۔ حاضر جواب تو تھے ہی۔ فوراً کہا کہ "چونکہ میں جج ہوں اس لئے میں اگر لکھتا تو ظاہر ہے کہ میں حکم نہیں بن سکتا تھا۔ اس لئے دوسروں کو موقع دیا"۔ میرا مضمون سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔ یہ اُن کی مہمان نوازی تھی۔ تصویر کشی میں دوسروں کو اچھا بتایا مگر سب نے واقعی کمال کر دکھایا — واہ واہ آفرین ہے! اقبالؔ جیسے شخص کو بھی صفائی سے شامل میں لپیٹ لیا ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ وہ ہر بات سے کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں۔

ہائیڈلبرگ — ۲۷۔ اگست ۱۹۰۷ء

صبح آٹھ بجے کی ٹرین میں ہم سب نکلے اور چھ گھنٹے میں میونک پہنچ گئے۔ ہمارے فلسفی رہنما اقبالؔ نے یہ انتظام کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ "میونک موسیقی اور شاعری کا مجسّم تخیّل ہے"۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ ایک ہوٹل میں گئے اور کھانا کھا کے فوراً چلے۔ اقبالؔ قدم قدم پر دلچسپ واقعات اور مشاہیر کے کارنامے بیان کرتے چلے جاتے تھے۔ آخر میں محل

اور انگریزی باغات میں پہنچے۔ وہاں کتابیں نکالیں اور کہا کہ "اسپینوزا تو ختم ہوا، آج آپ کو لیبنیز کا نقطۂ نظر سمجھایا جائے گا۔" پھر کہا کہ "ہر سال تین مہینے میں آپ کے پاس آکر رہوں گا اور علم النفس، تاریخ، اخلاقیات، فلسفۂ اخلاق شاعری اور فلسفۂ مابعد الطبیعات کے بارے میں جرمنوں نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ سب پڑھاؤں گا۔" جن کتابوں کے نام بتائے اُن کے بارے میں کہا: "ان کا مطالعہ کرنا اور ان پر تنقید لکھنا۔ تصوّف کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔" اس طرح شام تک دو ڈھائی گھنٹے تک ہم باغ میں فلسفیانہ سبق پڑھتے رہے۔

○

میونک —— ۲۸۔ اگست ۱۹۰۷ء

آج بہت سویرے نکل گئے اور قدیم و جدید قومی میوزیم، محلات، باغات، پکچر گیلریاں، گیلری اسکول، شہنشاہ لڈوگ ثانی کی "گیلری آف بیوٹیز" کو دیکھا۔ اقبال بظاہر شکستہ دکھائی دیتے ہیں مگر جب ان مقامات پر گئے تو انہیں اس قدر پُرجوش اور زندگی سے بھرپور پایا کہ میں حیرت سے اُن کو دیکھتی تھی اور اُن کی باتیں سنتی تھی۔ البتہ انہیں کلاسیکل موسیقی میں دخل نہیں ہے، مگر وہ اس کے قدردان بہت ہیں۔ جزیرۂ مسرّت کی جو تصویر ڈھنڈنے بنائی ہے، اس کے سامنے کھڑے ہو کر اقبال نے کہا کہ "شہر میونک ہی جزیرۂ مسرّت ہے جو خوبصورت تصوّر کے دریا میں ڈوبا ہوا ہے۔" ظاہر ہے کہ اقبال کو میونک زیادہ پسند ہے۔ شام کو ہیر پروفیسر رین کے مکان

پر گئے۔ ان کی بیٹی بہت قابل اور بہت زیادہ حسین اقبال کی پروفیسرہ چکی ہیں۔ اُس نے اقبال کو جرمن زبان اور دقیق کتابیں پڑھائی ہیں۔ میں ان لوگوں سے بے حد محظوظ ہوئی۔ فوراً ہی مذاکرۂ علمی شروع ہو گیا۔ فرالائن اقبال کا امتحان بہت دلچسپ طریقے سے لے رہی تھیں۔ اقبال جواب دیتے تھے اور فرالائن کہتی تھی کہ یوں نہیں، یوں! میں حیرت کے عالم میں مستغرق تھی۔ اور دل میں کہتی تھی کہ کتنی قابل اور لائق نازنین ہے کہ اقبال جیسے شخص کو بھی ٹوکتی ہے۔ ان کے سوال و جواب سے بہت زیادہ لطف آیا۔ اس کے بعد اُس نے پیانو بجایا۔ کیا کہنا ہے، ہر فن میں کامل و اکمل۔ سوال و جواب میں تین گھنٹے لگ گئے۔ گفتگو دماغ و قلب کو بہت کچھ منوّر کرنے والی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ اقبال کی اچھی طرح خبر لیتی ہے اور اقبال اس کے سامنے بالکل بے زبان اور منکسر المزاج بنے رہتے ہیں۔ فرالائن نے کہا کہ "اقبال نے تین مہینے میں جتنی جلد جرمن زبان سیکھی ہے اتنی جلد کوئی حاصل نہیں کر سکتا۔" اقبال نے جواب دیا کہ "اگر یہ تیز اور میٹھی چھری میری استاد نہ ہوتی تو ناممکن تھا کہ میں کچھ سیکھتا۔" اُنہوں نے اپنی مشہور کتاب جرمن میں لکھی ہے جس کی وجہ سے انہیں پی، ایچ، ڈی کی ڈگری ملی۔

○

میونک۔ ہائیڈلبرگ۔ ۲۹ اگست ۱۹۰۷ء

آج بہت سویرے اقبال کی رہنمائی میں ایک لمبی ڈرائیو کی۔ شہر کا گردوپیش بہت خوبصورت ہے۔ وہ اس دوران میں ہمیں تاریخ سناتے رہے۔

لائبریری میں ٹھہر کر انہوں نے چند قدیم عربی مخطوطات دکھائے اور کہا کہ "مجھے یہاں عربی کا علم حاصل ہوا ہے۔" پھر اسٹیشن پر گئے اور یہاں سے ہائیڈلبرگ پہنچ گئے۔ وہ سب استقبال کے لئے پھولوں کے ہار ہندوستانی وضع میں گوندھے ہوئے لائے تھے اور مکان کو چلتے چلتے سوالات پوچھتے رہے کہ اقبال نے کیا کیا دکھایا اور کیا کیا سنایا۔ کیونکہ انہیں تاریخ بہت زیادہ یاد ہے اور میونک پسند بھی بہت ہے۔ سینے شل نے کہا کہ "آپ لوگوں کی خوش نصیبی ہے جس سے ہم سب بھی بہت خوش ہیں۔" وہ میرے لئے گلاب لائی تھیں۔ یہ دیکھ کر اقبال نے کہا: "گلاب کا پھول گلاب ہی دیتا ہے" بڑے حاضر جواب ہیں۔

○

ہائیڈلبرگ ـــــ ۳۰۔ اگست ۱۹۰۷ء

آج سب کشتیوں میں گئے۔ "بوٹ ریس" ہوئی۔ اس میں اقبال کی کشتی سب سے آخر میں رہی کیونکہ وہ کتاب پڑھنے میں لگ گئے تھے۔ بڑا مزہ ہوا۔ جب ہم سب ان کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ وہ کتابوں میں مستغرق ہیں۔ فرالائن ویگے ناست نے کہا: "آج کشتی کی ریس مقرر ہے چلنا ہوگا۔" آخر سب مل کر انہیں گھسیٹ کر لے گئے اور پھر بہت خوشی سے شریک رہے۔ شام کو باغ میں سوال و جواب ہوئے۔ اس موقع پر اقبال بہت ہی ذی ہوش اور ہوشیار طالب علم بنتے۔ یہ بہت ہی لطف کا موقع ہوتا ہے اور سب مشتاق رہتے اور شریک ہوتے۔ تین گھنٹوں میں دنیا و مافیہا کو

چھلانگ مارتے۔

○

ہائیڈلبرگ ـــــ ۳۱۔ اگست ۱۹۰۷ء

آج آٹھ بجے ہم کوئی ۸۰ پروفیسر اور طالب علم ٹرین میں ندی کنارے نیکر وادی کا خوبصورت منظر دیکھتے ہوئے اس مشہور شلوس نیکر باتنشٹاین میں گئے جو بہت بلندی پر واقع ہے۔ اسے کسی بادشاہ نے بنایا تھا۔ یہاں قسم قسم کے پھولوں کے درخت ہیں۔ اقبالؔ نے کہا: "سیب کھانے کے لئے پل صراط سے گزر کر جنت میں داخل ہوئے ہیں۔" یہاں آنے کا منشا یہ ہے کہ ہر قسم کے پھلوں اور درختوں کی تصویریں بنائی جائیں اور خوب اچھی طرح سے کھانا کھایا جائے۔ ان جلسوں میں اقبالؔ کو بھی شریک ہونا پڑتا ہے اور خوبی تو یہ ہے کہ وہ بہت خوش اسلوبی سے شرکت کرتے ہیں۔ پھلوں کے جنگل نے تمام پہاڑی کو گھیر رکھا ہے۔ [illegible] درختوں میں سے گیا ہے۔ وہ مخروطی شکل کا ہے۔ [illegible] ندی کا پانی بھی ساتھ ساتھ بہتا چلا گیا ہے۔ [illegible] اور انتظام بھی نہایت اچھا ہے اس طرح خوشبودار [illegible] پھول جمع کرتے ہوئے نیچے آئے۔ پہاڑی کے دامن میں ایک مشہور ادبی ایڈ ہوٹل ہے۔ جس کے کھانے بہت لذیذ ہوتے ہیں۔ چونکہ بھوک لگی ہوئی تھی اس لئے خوب مزے لے لے کر کھایا۔ اس کے بعد فلاور اینڈ فروٹ ڈانس ہوا۔ سب کے ہاتھوں میں پھولوں اور پھلوں کی ٹوکری تھی۔ یہ منظر بھی عجیب تھا۔ فراویگے ناست

نے اقبال کے ساتھ کچھ تصویریں کھچوائیں اور سب نے خوب تالیاں بجائیں۔ یہاں بھی مقابلہ ہوا اور اقبال نے انعامات تقسیم کئے۔ ہر ایک بچوں کی طرح خوش و خرم تھا۔ مگر تمام وقت ورس ہوتا جاتا۔

○

ہائیڈلبرگ ــــ ۱۰-۲ستمبر ۱۹۰۷ء

آج ہم میڈم شیرر کی رہنمائی میں دو دن کے سیر سپاٹے کے لئے آٹرباغ گئے۔ یہاں ایک نیچرل ہسٹری میوزم ہے اور اسلحہ کا بھی عجائب خانہ ہے۔ ہر قسم کے پرندے مسالے بھر کر رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی تاریخ بھی درج تھی۔ اور یہ بھی دکھایا گیا تھا کہ ان کی زندگی کیسے گزرتی ہے۔ اسلحہ کے برتنے کے طریقے بھی کھیلوں کے ذریعہ دکھائے گئے تھے۔ یہ بہت کاریگری اور ہنر کا کام ہے۔ اس میں اقبال نے بالکل کمال کر دیا معلوم نہیں تھا کہ ان چیزوں میں بھی ان کو دخل ہے۔ کس قدر نیا اور دلچسپ طریقہ ہے تعلیم دینے کا۔ یہ سب باتیں یہاں کی تعلیم میں شامل ہیں یہی غالباً سبب ہے کہ اقبال جرمنی اور جرمن لوگوں کے دلدادہ اور شیدا ہیں۔

○

ہائیڈلبرگ ــــ ۳-ستمبر ۱۹۰۷ء

اقبال کی ظرافت اور حاضر جوابی بے مثل ہے۔ چونکہ کورس ہے لہذا ہم سب کھڑے کھڑے بات چیت کر رہے تھے۔ فرالائن ویگے ناست، سینے شنل اور کاٹینا میرے گرد و پیش تھیں اور اقبال سامنے کھڑے ٹکٹکی

لگائے بُت بنے دیکھ رہے تھے۔ اس پر فرا پروفیسر شیرر نے کہا کہ "اقبالؔ کیا دیکھ رہے ہو؟ تم مبہوت سے نظر آتے ہو۔" اقبالؔ نے برجستہ جواب دیا: "میں یکایک ہیئت دان کی صورت میں تبدیل ہو گیا ہوں۔ میں ستاروں کے اس جھرمٹ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔" رات کھانے پر ایک لڑکی کو دیکھ کر مجھ سے کہتے ہیں:۔

اس کے عارض پر سنہری بال ہیں
ہو طلائی اُستُرہ اس کے لئے

ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ تمام وقت اسی قسم کے اشعار کہتے رہے۔ اقبالؔ کس قدر ہمہ گیر اور ہر خوبی سے معمور ہیں۔

○

ہائیڈلبرگ — ۴ ستمبر ۱۹۰۷ء

آج صبح چھ گھنٹے پھلوں کے مشہور و معروف باغ میں گزارے۔ ہر ایک نے کھانا الگ الگ تیار کیا تھا۔ سب ایک جگہ رکھا گیا، چکھا گیا اور جانچا گیا۔ نقائص اور خوبیاں ہر ایک کے متعلق بیان کی گئیں۔ اس میں اقبالؔ کا تیار کردہ کھانا بھی موجود تھا جو ہندوستانی طرز کا تھا۔ بہت لُطف رہا۔ خدا حافظ کہنے کی رسمیں ادا ہو رہی تھیں۔ جب جانے لگے تو سب کے سب ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔ مجھے سامنے کھڑا کیا گیا اور بینڈ کے ساتھ یہ گانا سنایا گیا۔ اقبالؔ رہنمائی کرتے اور الفاظ ادا کرتے اور پھر باقی لوگ انہیں گاتے۔ یہ گانا طیبؔ نے انشا کیا ہے۔ وہو ہذا:

آخرکار ہندوستان کے نہایت درخشاں ستارے کو
خدا حافظ کہنے کا وقت آ ہی گیا
وہ تارہ جو یہاں چمکتا تھا اور رقصاں رہتا تھا
اور دُور و نزدیک کے مجمعوں کو روشن کرتا تھا —
جو امن اور شانتی کے جھنڈے کی طرح خبر گیری کرتے ہوئے
ہر جگہ برہم مزاجوں کو سکون دیتا تھا —
ہم ایک بڑی آہ سے آراستہ ہو کر آئے ہیں
جو دُور و نزدیک اور ہر بلندی تک جاتی ہے —
ہاں تم جنہیں ان اشعار میں مخاطب کیا گیا ہے
ہماری بہترین دُعائیں اور برکتیں اپنے ساتھ لیتی جاؤ —
ہماری بہترین خواہشات تمہارے ساتھ رہیں گی۔
دریاؤں، سمندروں اور جھیلوں کو عبور کرتے وقت —
شان و شوکت اور کامیابی کے ساتھ واپس لوٹو
تمہارے دوست بہت بڑی تعداد میں منتظر ہیں —
لہذا اس وقت تک کے لئے ہم کہتے ہیں۔
خدا حافظ، الوداع، خدا کرے ہم پھر ملیں !!

ایک بھولی ہوئی صحبت[1]

میں عطیہ بیگم صاحبہ کا شکر گزار ہوں کہ اُنہوں نے مجھے یہ موقع دیا کہ میں آپ کے سامنے علامہ اقبالؔ کے متعلق ایک بھولی ہوئی صحبت کا حال بیان کردوں۔ میں اپنے تئیں خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ گزشتہ تیس پینتیس سال میں مجھے وقتاً فوقتاً علامہ موصوف کی خدمت میں حاضری دینے کا شرف حاصل رہا ہے۔ سب سے پہلے مجھے دہلی میں ۱۹۱۱ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل

---

[1] یہ مضمون ۲۷۔اپریل ۱۹۴۶ء کو اقبالؔ ڈے کے موقع پر پڑھا گیا تھا جو انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی کے ہال میں نواب حسن یار جنگ بہادر، امیر پائیگاہ حیدرآباد کی زیر صدارت منایا گیا تھا۔ اس جلسہ کو محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ نے ترتیب دیا تھا۔

کانفرنس میں اُن کی زبانِ فیض ترجمان سے نہ صرف اُن کی رُوح پرور تقریر سننے کی سعادت نصیب ہوئی بلکہ وہ نظم بھی سنی جو اُنہوں نے اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ پڑھ کر سنائی تھی اور جس کی آواز سے میرے کان اب تک لذت گیر ہیں۔ وہ نظم یثرب کے متعلق تھی اور وہ آپ کو "بلاد اسلامیہ" کے عنوان کے ماتحت "بانگ درا" میں ملے گی۔ اس نظم میں انہوں نے درحقیقت ان احسانات کو گنوایا ہے جو اسلام کی بدولت دنیا کو نصیب ہوئے اس کانفرنس میں خواجہ کمال الدین مرحوم اور ہز ہائی نیس آغا خاں جیسے اکابر قوم بھی موجود تھے۔

اس کے بعد لاہور اور بمبئی میں میری مرحوم سے ملاقاتیں رہیں مگر آج میں بمبئی کی صرف ایک صحبت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ گول میز کانفرنس سے لوٹتے وقت علامہ موصوف نے بمبئی میں چند دن قیام فرمایا تھا۔ اس موقع پر محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ نے اُن کے اعزاز میں اپنے تاریخی مکان "ایوان رفعت" میں ایک شاندار پارٹی کا انتظام کیا تھا جس میں رؤسا اور مہاراجگان کے علاوہ اسلامی ممالک کے قونصل اور مرزا علی اکبر خاں مرحوم جج ہائی کورٹ، بمبئی، مولانا محمد عرفان مرحوم، ڈاکٹر جی ایم ڈی صوفی جیسے بہت سے فاضل حضرات بھی تشریف فرما تھے۔ اس وقت جب حاضرین سے ان کا تعارف کرایا جا رہا تھا تو میں دیکھ رہا تھا کہ لوگ ان سے نہایت عقیدت مندانہ احترام سے مل رہے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے علامہ کا صرف نام ہی سُنا تھا اور ان کے شاعرانہ کمالات

سے مطلق واقف نہ تھے۔ مجمع نے علامہ موصوف سے درخواست کی کہ وہ بذریعہ تقریر اپنے ارشادات سے حاضرین کو مستفید فرمائیں اور کوئی پیغام بھی عطا کریں۔ جواب میں علامہ نے انگریزی میں ایک مختصر سی تقریر کی، اور فرمایا کہ بطور پیغام کے میں صرف ایک شعر پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔ وہ شعر یہ ہے ؎

چناں بزی کہ اگر مرگِ تست مرگ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ تو ایسی حسین و جمیل زندگی بسر کر کہ اگر تیری موت فی الحقیقت دائمی موت کی شکل اختیار بھی کر لے تو خود خدا تعالیٰ کو شرم محسوس ہو کہ ہائے کیسی پُر عظمت چیز فنا کے گھاٹ اتار دی گئی ہے اور اسے ابدیت کیوں نہ بخشی گئی۔

جب علامہ اقبال یہ شعر پڑھ رہے تھے اس وقت سننے والوں میں جو اصحاب فارسی دان تھے وہ اس کے تخیل کی گہرائی سے بے حد متاثر نظر آتے تھے اور شعر کے ایک ایک لفظ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس شعر میں انسانی زندگی کی غیر معمولی عظمت کا جس طریقہ سے اعتراف کیا گیا ہے وہ اقبال ہی کا حصہ تھا۔ "شرمسار تر گردد" کے الفاظ نے جن سے وہ بارگاہِ الٰہی میں حضرت اقبال کی جسارت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے، اس شعر کی خوبی میں خاص لطافت پیدا کر دی ہے ——!

جب علامہ تقریر ختم کر چکے تو دوست احباب نے انہیں گھیر لیا اور اصرار کیا کہ اس شعر کا انگریزی میں ترجمہ بھی کر دیا جائے۔ چنانچہ علامہ نے ان کی درخواست کو شرف پذیرائی بخشا اور ذیل کا ترجمہ لکھوایا۔ فرماتے ہیں :—

LIVE SO BEAUTIFULLY

THAT IF DEATH IS THE END OF ALL,

GOD HIMSELF MAY BE PUT TO SHAME

FOR HAVING ENDED THY CAREER."

اس کے بعد چائے نوشی ہوئی اور اقبالؔ حاضرین سے خوش گپیاں فرماتے رہے۔ جب چائے نوشی کا سلسلہ ختم ہو گیا تو "ایوان رفعت" کے ہال میں رقص و سرود کا انتظام کیا گیا۔ رقص و سرود کے دوران میں علامہ اقبالؔ نے فی البدیہہ تین اشعار قلمبند کر کے عطیہ بیگم صاحبہ کی خدمت میں پیش کیے۔ وہ شعر یہ ہیں ؎

ترسم کہ تو می رانی زورق بہ سراب اندر

زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر

برکشت و خیاباں پیچ بر کوہ و بیاباں پیچ

برقے کہ بخود پیچد میرد بہ سحاب اندر

ایں صوتِ دلآویزے از زخمۂ مطرب نیست

مہجور جناں حورے نالد بہ رباب اندر

یہ اشعار بھی بجائے خود ایک مستقل پیغام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں انسان کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ دنیا پر چھا جائے اور سکڑی ہوئی زندگی بسر نہ کرے۔ آخری شعر میں غالباً اس موسیقی کی داد دی گئی ہے جس کا انتظام ۱۰۔ ستمبر کی سہ پہر کو "ایوان رفعت" میں کیا گیا تھا۔

یہ مخصوص صحبت گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں ختم ہو گئی مگر آج بھی اس کی یاد میرے دماغ میں جوں کی توں محفوظ ہے۔ میں ان چند گھڑیوں کو جو ۱۹۳۱ء کی ایک سہانی شام کو "ایوان رفعت" میں ڈاکٹر اقبال کی معیت میں صرف ہوئیں، اپنی زندگی کے بہترین اوقات میں شمار کرتا ہوں۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ اقبال جو بات کرتے وہ یا تو پاکیزہ مذاق کا پہلو لئے ہوئے ہوتی تھی یا گہری فلسفیانہ ہوا کرتی تھی۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اقبال کی ساری زندگی ایسی ہی بذلہ سنجیوں پر مشتمل رہی۔ اگر ڈاکٹر جانسن کی طرح ہمارے ڈاکٹر اقبال کو بھی کوئی باسویل جیسا سوانح نگار مل جاتا جو سایہ کی طرح اُن کے ساتھ ساتھ رہتا اور اس طرح کی ہزارہا صحبتوں کے واقعات کو قلمبند کرتا رہتا تو آج کو ہماری زبان کس قدر مالدار ہو جاتی۔ جیسا کہ خواجہ حالی نے اپنے استاد مرزا غالب کے متعلق لکھا ہے۔ ع

اُس کی تھی بات بات میں اک بات

بعینہٖ یہی کیفیت علامہ مرحوم کی تھی۔ وہ جب آنکھیں نیم وا کئے باتیں کیا کرتے تھے تو اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے منہ سے حقیقتاً پھول جھڑ رہے ہیں۔ یہ بہت بڑی ادبی اور علمی خدمت ہو گی اگر اقبال کے

بارے میں ایسے تمام واقعات کو جمع کر لیا جائے جو اب تک عام نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ یاد رکھئے کہ اقبالؔ کے خیالات اور افکار قومی سرمایہ ہیں اور ضرورت ہے کہ اس قومی سرمایہ کو پوری طرح سے اور جلد سے جلد محفوظ کر لیا جائے۔

۲۷۔اپریل ۱۹۷۶ء ضیاء الدین احمد برنیؔ

عکسِ
خطوطِ
اقبال

Trinity College
Cambridge
24th April 07.

My dear Miss Fyzee,

I enclose herewith one of the poems I promised to send you, and shall feel obliged if you could read it carefully and let me know of your criticism.

I was thinking of sending you a copy of my Political Economy in Urdu, but I am sorry I have not got one here, though it would not be difficult to get it from India. I shall write for it this mail.

Hoping you are getting on well.

Yours very sincerely
S. M. Iqbal

Lahore
13th Jan. 09.

My dear Miss Atiyya,

Thank you so much for the very kind letter which I have just received to my great relief. I had a mind to come to Bombay for a personal expression of sympathy, but unfortunately on the 29th of Dec. when I was participating in one of conference discussions I received a telegram from home telling me that my brother was seriously ill. I had to run to Sialkot the same afternoon. The remaining holidays I looked after him. Thanks good luck he is alright

now. God has spared him for me. I have spent & am still spending so much of his money. His loss would have been dreadful from every point of view.

He is extremely kind of their Highnesses & yourself to ask me to come to Jamjira. Nothing could be more pleasant as well as profitable intellectually & physically. But you are aware that I have just started my business which requires my constant presence at the Station. For the sake of others I must forego the pleasure of your society in spite of a strong — almost irrepressible desire — to come

and help you & your sister in getting over your recent sorrow. I feel I can be of some ~~use~~ use to you in this respect, but I am constrained to be cruel to my sentiments in suppressing them for considerations whose force makes itself felt — situated as I am — all the more vehemently.

Please do not dislike for me for this bit of worldly wisdom which, of course, is folly when we are in the dreamland of Poetry. It is therefore not possible for me to come to Jangira in the near future. I may however manage to see you during the September holidays when the Chief Court is closed. To spend some

time in the company of their
highnesses & yourself in whom
intellectual treat and
pleasure are combined.
Please convey my most
respectful salams to them
and assure them of the
goodwishes of a far off
friend whom circumstances
cannot rob of his imagination
though they have cruelly
robbed him of innumerable
opportunities to visit you
& their highnesses.

Yours ever
S. M. Iqbal
Bar-at-Law.

P.S.
My book on Persian Metaphysics
is published, I shall soon send
you a copy. The Poems (lyrical)
I hope to publish soon. They will
be printed in India, bound in Germany
& devoted to Indian Lady.

Lahore

9th April 09.

My dear Miss Fyzee

Thank you so much for your very kind letter which I received this morning.

I cannot tell you who is Mr. Mir Muhammad Iqbal; you do not know him; but you know his wife & I hope you will be able to identify him by this clue.

Yes I refused the Aligarh chair of Philosophy a few days ago & refused to accept the Government College chair of History. I do not wish to enter any service. My object is to run away from this country as soon as possible. You know the reason. I owe a sort of moral debt to my brother which detains me

my life is extremely miserable.
They force my wife upon me.
I have written to my father that
he had no right to arrange
my marriage especially when
I had refused to enter into any
alliance of that sort. I am
quite willing to support her,
but I am not prepared to
make my life miserable by
keeping her with me. As a
human being I have a right
to happiness — if society or
nature deny that to me,
I defy both. The only cure is
that I should leave this wretched
country for ever, or take refuge
in liquor which makes suicide
easier. These dead barren
leaves of books cannot yield
happiness; I have got sufficient fire
in my soul to burn them up and
all social conventions as well.
A good God created all things, you may
say. May be. The facts of this life,
however, tend to a different conclusion:
It is intellectually easier to believe in an eternal
omnipotent Devil rather than a
good God. Please excuse me for
these utterances. I do not want

sympathy. I wanted only to disburden my soul. You know all about me, & for this reason I have ventured to give expression to my feelings. This is a confidence; please do not tell anybody. I hope you understand now why I refused service.

I am extremely sorry that I haven't been able to get an [illegible] for you. The Secretary of the Anjuman told me the other day that it was not possible to get one. The other day I delivered a public lecture on the meaning of religion as a factor in the evolution of society. I took down only a few notes. I do not know whether anybody took down what I said. The Anjuman lecture will be in English — "Islam as a moral & political ideal". If it is printed I shall send you a copy. I shall ask the Editor of the Observer to send a copy of the Observer to you.

Abdul Qadir has come to Lahore to practise in the Chief Court.

I am sorry to hear that you do not believe me when I say that I wish to come to Bombay to see you & their Highnesses who were so very kind to me. I certainly do wish to come over — whether this would be possible I cannot say at present. No greater relief to me than this.

Two three weeks ago I received a letter from your friend Frl. Wegenast. I like the girl, she is so good & truthful. I have written to her & to the good old Frau Professor.

Please remember me to their Highnesses & assure them of my friendship — which though not of much use to them — is none the less true & unflinching.

Yours Sincerely
Iqbal

Lahore
17th Ap. 09.

My dear Miss Atiya,

Thank you for the consoling words — your letter has brought me great relief. I so wish to see you & pour out my entire self before you. You say you want to ask me many questions — why don't you? Your letters to me are always kept in a safe chest; nobody can see them. And you know I withhold nothing from you & I believe it is a sin to do so. I admit, my letters are not at all satisfying as you say — but they are necessarily so for the reasons you mentioned in your last letter. Don't accuse me of forgetfulness; I forget nothing; but I shd like to hear the explanation simply because I wish to see how you explain. Last night I went to heaven & happened to pass through the gates of Hell. I found the place dreadfully

cold. They told me, when they found me amazed, that the place was cold in its own nature; but that it would become intensely hot since everybody had to bring his own fire from the world. I am preparing to collect as much burning coal as possible in this country where there are abounding coal mines.

I often see Abdul Qader, almost every day in the Barroom of the Chief Court, but we have not talked about you for a long time. I do not talk much with others now; my own wretched self is a mine of miserable thoughts which emerge snake-like from the deep darkness of my soul. I think I shall become a snake charmer and walk about in the streets with a host of curious boys behind me.

Don't think that I am a pessimist. I tell you misery is most delicious; and I enjoy my misfortune and laugh at those who believe they are happy. You see how I steal my happiness.

I received a letter from Miss Wygonant some time ago. When I write to her I shall remind her of the days when you were in Germany — the days which will never come again. She is at present at her own place — Heilbronn; but, I believe she must have come by this time to Heidelberg to assist Frau Prof. in her teaching work. You may rest assured that she is quite well. Please excuse my bad writing. I don't remember what I have written before — each moment bring its own thought with it, so that if you find my letter incoherent forgive the vagrant.

As regards the *ustani* I have received an application today forwarded to me by the Superintendent of Zenana Schools of the Anjuman-i-Himayat Islam Lahore. I am going to correspond with her and shall soon let you know of the result. But I should like to know whether she will have to teach in a Public Girls School, and in Janjira or Bombay. My elder brother is transferred to a place about 16 miles from Bombay. He will proceed shortly.

Two issues of the Observer are sent herewith. I hope you will find them interesting. Please remember me to their Highnesses and Saligi.

Yours very sincerely
Iqbal

Lahore
17th July 09.

My dear Miss Atiya,

Thank you very much for your letter which I have just received. I find myself extraordinarily cheerful this morning; so please excuse me if you discern a vein of humour in my letter. I have not changed my plans; you are not justified in making the inference from my silence. But, of course, I am sometimes scared by two boats, one steamer, two tongas and two trucks — a veritable هفت خوان which would bring me the fame of Rustom if I could get through it. The need of Rustom was great and I am not certain what my need would be. I generally make up my mind to do a certain thing & then give myself up to circumstances leaving them to carry me whither they will.

You are not conscious of what
good you have done me — this
is true & better so. You could
not have been conscious of it.
I am conscious of it, but cannot
give any expression to it. Let
us drop the subject. It would
be futile on my part to describe
the indescribable, & then you
say you are not open to conviction.
Those pretty grievances (you are
wrong in describing them petty) may
I know them? You will not
stint information on this terrible
specialty of these grievances
against me — of course
everybody is waiting patiently
for the place of rest. I am
anxious to go to that place
because I shd like to meet
the Creator and call upon
him to give me a rational
explanation of my mind — which
I think is not an easy
task for him to do. I am
incomprehensible to myself —
you shd not complain. Yours

ago I wrote —

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے!
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

Many people have made similar statements about me & I have often laughed at myself in solitude. I now propose to give a final answer to such statements, & you will see it published in the مخزن. I have merely put what people think about me; the answer is yet to be versified.

I am sorry to hear that you were distressed to find people in North India not respecting & admiring me. I tell you that I do not care for other peoples' respect — I do not mean to live by other peoples' breath —

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسہ بھی چھوڑ دے

I live a straightforward honest life; my heart is in perfect unison with my tongue. People respect and admire hypocrisy - If hypocrisy buys me fame respect and admiration I would rather die unknown & unlamented. Let the manyheaded monster of public give their doses of respect to others who act and live in accordance with their false ideals of religion & morality - I cannot stoop to respect their conventions which suppress the innate freedom of man's mind. Byron, Goethe and Shelley were not respected by their contemporaries — and though I am far inferior to them in poetic power I am proud that I am in their company in this respect.

Have I instructed you? You never stood in need of instruction. I remember I introduced you to Plato - but there it ended. We read so little of it that

I cannot justly claim the
honour of having interested
you. You say I have no
regard for your wishes!!
This is indeed strange;
for I always make it
a point to study your
wishes and to please
you in any way I can.
But sometimes, of course
such a thing is beyond my
power. The force of my
own nature impels me in
a different direction.
"Otherwise you would be
more careful". I confess
I do not understand what
you mean. Please explain
to me ~~how~~ in what respect
I sh'd be more careful. I am
ready to do all that will
please you. The world
cannot worship me. I and
not be worshipped; since

my nature is such that I cannot become an object of worship — so intensely deeply is ingrained in me the instinct of a worshipper. But if the innermost thoughts of my soul are ever revealed to the public, if what lies concealed in my heart is ever expressed — then, I am sure, the world will worship me someday after my death. They will forget my sins, and give me the tribute of a tear.

The Lt. Governor was willing to recommend me to the Sec. of State for India for the vacant Professorship

in the Lahore Govt college, but I have given up the idea of standing a candidate for the appt. much against my personal inclination. Force of circumstances compells me to consider things from a financial point-of-view — a ~~point~~-of-view which was revolting to me a few years ago. I have decided to continue in the legal profession trusting in God's help.

Could you send me a copy of the poem I wrote to you from Munich? I have got no copy of it and I wish to keep one with me.

Please convey my salaams to all at the Hippeum (?)

Yours sincerely
Muhammad Iqbal

Lahore
30th Mar. 10

My dear Miss Atiya,

Thank you so much for your letter which I enjoyed very much. Nothing is more enjoyable than a letter from a friend. I received His Highness' invitation at Hyderabad and soon after I wrote to you as to why it was not possible for me to come to Janjira. Yesterday on my return I received the letter — the sweet scolding — and wired to His Highness that I could not come owing to my college engagements which has handicapped me so often. If I could have stayed a little more at Hyderabad I am sure His Highness the Nizam would have

expressed a desire to see me.
I saw all the big people there
& most of them invited me
to their place. My visit to
Hyderabad had some meaning
which I shall explain to you
when we meet. The Hydaris are
not the only consideration of
my visit. Perhaps you know
that I have not had the
pleasure of their acquaintance
before I saw them at Hyderabad.
I enjoyed my stay with them
immensely. It is extremely kind
of Mrs Hydari to speak so kindly
of me. I felt quite at home
in her house. I like the
intensely Arab spirit in
her, and I have a great
admiration for her good sense
& wisdom in all the
affairs which attract her
attention or sympathy. It was
chiefly through the influence of
Mr & Mrs Hydari that I had

the good fortune to see some of the best specimens of the Hyderabad society. Mr. Hydari is a man of great culture & broad sympathies. I expected him to be a man of dry facts & figures, but nature has gifted him with a very fine imagination & a very tender heart. I have immense respect for both of them. Theirs is the second real home that I have seen — the first being the Arnolds. Mrs Hydari is a person of intuition whereby she can see things more clearly than we men by their cold analysing reason.

Now would you be so good as to convey my apologies to their Highnesses & ask pardon on my behalf. I really do not know what became of my letter which I wrote to you after the receipt of His Highness's invite. I am unfortunately a man who does not reveal his affections but they are none the less deep for want of expression. People are apt to think that I am cold. Please assure their Highnesses that

I am always at their disposal, & whenever it is possible for me to come to Janjira I shall do so with the greatest pleasure. I had only ten days casual leave which expired on 28th. I left Hyderabad on the 23rd & it takes about 4 days to reach Lahore from Hyderabad. Moreover I had to visit Aurangzeb's tomb on my way back on which I am going to write the most stirring poem that the readers of Urdu have ever read. I reached Lahore on the morning of the ~~28th~~ 29th, & had to go straight to the college & thence to the court. Under these circumstances you can see for yourself ~~so~~ it was not possible for me to make a trip to Janjira. I had, therefore, to forego the pleasure of seeing their Highnesses. I hope this explanation will convince you & you will act the advocate for me. I have got my faults, but certainly not hypocrisy & indifference. Perhaps I am a ~~mystery~~ mystery (even to myself!) as you would like to put it; but this "mystery" is known to everybody.

"وہ راز ہوں کہ زمانے پہ آشکار ہوں میں"

My ways may be strange, but there
are people in this wicked world
whose ways are stranger than mine.
Opportunity is the only test of a man's
real nature. If any opportunity comes
I shall certainly show you how
intensely I love my friends &
how deeply my heart bleeds for
them all. People hold life dear &
rightly so; I have got the strength
to give it freely away when it
is required by them. No! don't
call me indifferent or hypocrite.
not even by implication, for it
hurts my soul & makes me
shudder at your ignorance of
my nature. I wish I could turn
inside outward in order to give
you a better view of my soul
which you think is darkened by
hypocrisy & indifference.

Please ask forgiveness on my
behalf for this unavoidable
remissness & let me know
immediately that my explanation
has convinced him.

Yours ever
Mohd Iqbal

Lahore
7th. July '1911

My dear Miss Fyzee,

I am so sorry that I have not been able to attend to your very kind letter which I received sometime ago. The reason is that I have been very much upset during these days. — My misfortune has been following me like a faithful dog; and I have learnt to like the Dame for her untiring loyalty to her miserable King. Details I shall let you know later on.

As regards the poems I shall be glad to send you a copy of. A friend of mine has lent me his collection of my poems and I have engaged a man to transcribe it for me. When his work is over I shall revise

the whole, rewrite the poems fit for publication & send a copy of them to you. You need not be grateful to me, since making you happy, as you say in your kind letter, is my sufficient reward. On the other hand I am grateful to you for the admiration which I doubt deserve at all. But which all you do will. These poems — these wailings of a bleeding heart? There is nothing of cheerfulness in them. As I say in my dedication —

"خندہ ہے پر طلسم غنچہ شکست نہ سمجھ
تو تبسم سے مری کلیوں کو نا محرم نہ سمجھ
درد کے نالے سے سرشار کی نفس
فطرت شاعر کے آئینے میں جوہر غم نہ سمجھ"

My great difficulty is selection for publication. During the last 5, 6 years my poems have become more of a private

nature & I believe the public have no rights to read them. Some of them I have destroyed altogether for fear of ~~that~~ somebody ~~[illegible]~~ stealing them away & publishing them. However I shall see what I can do. Father has asked me to write a masnawi in Persian after Bu Ali Qalandar's; & in spite of the difficulty of the task I have undertaken to do so. Here are the opening verses —

"نالہ را انداز نو ایجاد کن — بزم را از ہائے و ہو آباد کن
آتش استی بزم عالم برفروز — دیگران را ہم ازیں آتش بسوز
سینہ را سر منزل صد نالہ ساز — اشک خونیں را جگر پرکالہ ساز
پشت پا بر شورش دنیا بزن — موجۂ بیرون ازیں دریا بزن"

The rest I have forgotten, but hope to be able to recollect ~~them~~ when I return from court. It is now 10 & I must be going. Herewith is enclosed a sig which is recently published — in

the rest. I have written to my friend Sardar Umrao Singh (whom I suppose you know) to send me a copy of this Eng. translation of a few verses which I wrote to Miss Gottesman (a friend of Princess Dhalip Singh) on her presenting to me a beautiful flower plucked from the Shalamar Gardens. The original, I am afraid, is not with me. I shall try to find it out for you.

Please remember me to their Highnesses & oblige

Yours sincerely

Md. Iqbal

Lahore

14th Dec. 1911

Dear Miss Wegenast,

Thank you so much for your kind letter which I received a moment ago. Do not show the poem to Mrs Naidu if you think she cannot appreciate Urdu poetry.

This is one of the new poems which are yet nowhere published. Here are a few ~~more~~ more verses which I wrote the day before yesterday early in the morning at 4 A.M. I have never tried this metre before. It is extremely musical; I wish I had been there to sing the poem to you on the [illegible]

Yours sincerely

M. Iqbal

P.T.O.

Lahore
14th Dec.

The Partition of Bengal — the Severance of the Muslim Bengal from the Hindu Bengal was — so the Bengalee Hindu thought — a mortal wound inflicted by the Govt. on the hearts of Bengali nationality. The Govt. however, have cleverly undone their own doing by the imperialisation of Delhi. The Bengalee thinks he has scored a great point, little thinking that his importance has thereby been reduced to zero-point. Here are two verses on this point —

مندمل زخمِ دلِ بنگال آخر ہو گیا — وہ جو تھی پہلے تمیزِ کافر و مومن گئی
تاجِ شاہی لے کے کلکتے سے دہلی آ گیا — مل گئی باؤ کو جوتی اور پگڑی چھن گئی

محمد اقبال

Dr. Sir Mohd. Iqbal. Kt.
M.A. Ph. D.
Barrister-at-Law.
Lahore

29th: May 1933

My dear Atiya Begum

I have not yet heard about your memorial
As to Palestine affairs I am afraid you are not correctly informed. I have advised the Mufti not to come to India till at least the middle of October. I cannot say whether he will take my advice. What Shaukat Ali says of me is really a compliment which I do not deserve. I am only a lump of clay like him & nothing more. My Private-secretary in Spain — an English girl — suddenly changed her attitude towards me & began to serve me more like a nurse than a private secretary. I asked her the reason of this sudden change of attitude which was quite noticeable. She explained that she had discovered me to be a Divine Being! It is not possible for me to define or describe myself positively; I can do so only negatively i.e., that I am not an idiot.

If you are serious about an All India Muslim Women's Conference you should not start it under the auspices of any Conference or League. This must be an independent organisation. For its general policy you can of course consult members of the Conference.

There is a possibility of my going to Europe about the end of July. I shall let you know if anything comes out of it.

Yours sincerely
Muhammad Iqbal

نمودِ صبح

آتی ہے مشرق سے جب ہنگامہ در دامن سحر - منزلِ ہستی سے کر جاتی ہے خاموشی سفر
محفلِ قدرت کا آخر ٹوٹ جاتا ہے سکوت - دیتی ہے ہر چیز اپنی زندگانی کا ثبوت!
چہچہاتے ہیں پرندے پا کے پیغامِ حیات! - باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرامِ حیات!

مسلمِ خوابیدہ! اُٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ چمک اٹھا افق! گرمِ تقاضا تو بھی ہو!

دورۂ عالم میں رہ پیما ہو مثلِ آفتاب - دامنِ گردوں سے ناپیدا ہوں یہ داغِ سحاب
کھینچ کر خنجر کرن کا پھر ہو سرگرمِ ستیز - پھر سکھا تاریکیِ باطل کو آدابِ گریز!
تو سراپا نور ہے زیبا ہے عریانی تجھے - اور عریاں ہو کے لازم ہے خود افشانی تجھے

ہاں نمایاں ہو کے برقِ دیدۂ خفاش ہو
اے دلِ کون و مکاں کے رازِ مضمر فاش ہو!

محمد اقبال [illegible]
[illegible]

دعا

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے - جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے
پھر وادیِ فاراں کے ہر ذرہ کو چمکا دے - پھر شوقِ تماشا دے پھر ذوقِ تقاضا دے
محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے - دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
پیدا دلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر - اس محملِ خالی کو پھر شاہدِ لیلا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل - اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے
آتشِ ہستی جسکی کانٹوں کو جلا ڈالے - اس بادیہ پیما کو وہ آبلہ پا دے
رفعت میں مقاصد کو ہمدوشِ ثریا کر - خود داریِ ساحل دے آزادیِ دریا دے
اس دور کی ظلمت میں ہر قلبِ پریشاں کو - وہ داغِ محبت دے جو چاند کو شرما دے

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

محمد اقبال [illegible]

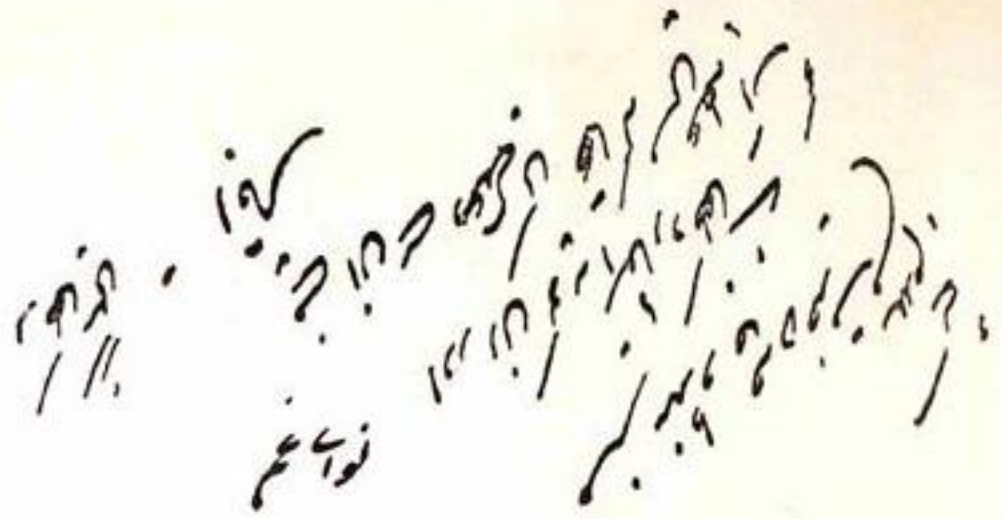

نوائے غم

زندگانی ہے مری مثلِ ربابِ خاموش — جس کی ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش

بربطِ کون و مکاں جس کی خموشی پہ نثار — جس کے ہر تار میں ہیں سینکڑوں نغموں کے مزار

محشرستانِ نوا کا ہے امیں جس کا سکوت — اور منت کشِ ہنگامہ نہیں جس کا سکوت

آہ ! امیدِ محبت کی بر آئی نہ کبھی

چوٹ اس ساز نے مضراب کی کھائی نہ کبھی !

مگر آتی ہے نسیمِ چمنِ طور کبھی — سمتِ گردوں سے ہوائے نفسِ حور کبھی

چھیڑ آہستہ سے دیتی ہے مرا تارِ حیات — جس سے ہوتی ہے رہا روحِ گرفتارِ حیات

نغمۂ یاس کی دھیمی سی صدا اٹھتی ہے — اشک کے قافلے کو بانگِ درا اٹھتی ہے

جس طرح رفعتِ شبنم ہے مذاقِ رم سے

میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے !

محمد اقبال

پرائیویٹ

عالم خس خوں غم ہے ذرا کل کی کہہ!

کہنے کی حکم ہے؟ دیوانہ جنوں یا نہ جنوں

محمد علی

بمبئی ۱۰ / ستمبر ۳۱ء

مطبوعات

اقبال اکیڈیمی ، پاکستان ، کراچی

* اقبالیات کا تنقیدی جائزہ	احمد میاں اختر	۵۰.۰
* اقبال کے خطوط عطیہ کے نام	ضیاءالدین برنی	۳۵۰.۰
* اقبال ایرانیوں کی نظر میں	عرفانی	۸۷۵.۰
* مکتوبات اقبال	نذیر نیازی	۵۰.۰
* اسلامی تصوف اور اقبال	نورالدین	۶۵۰.۰
* اقبال کے آخری دو سال	عاشق بٹالوی	۲۰۰.۰
* اقبال اور حیدرآباد	نذر حیدرآبادی	۵۰.۰
* اسرار و رموز پر ایک نظر	محمد عثمان	۳۵۰.۰
* اقبال اور سیاست ملی	رئیس احمد جعفری	۵۰.۰
* علم الاقتصاد	علامہ اقبال	۵۰.۰
* اقبال اور جمالیات	نصیر احمد ناصر	۱۲۰.۰
* انوار اقبال	بشیر احمد ڈار	۱۲۰.۰

تقسیم کنندگان

آئینۂ ادب ، چوک مینار، انارکلی
لاہور

طباعت سرورق رپن پریس لیٹڈ۔ لاہور